تیرِ نیم کش
سید محمد جعفری

سیّد محمد جعفری



سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

# ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| | پیش لفظ | ۵ |
| ۱- | آئین ۱۹۵۶ء | ۱۵ |
| ۲- | قربانی کے بکرے | ۲۰ |
| ۳- | مہنگائی اور عید | ۲۴ |
| ۴- | کراچی | ۲۶ |
| ۵- | قائدِ عوام | ۳۰ |
| ۶- | ۱۴/اگست | ۳۳ |
| ۷- | کاغذ کی گرانی | ۳۶ |
| ۸- | پٹرول کی راشننگ | ۳۸ |
| ۹- | کثرتِ اولاد | ۴۱ |
| ۱۰- | عید کی اچکن | ۴۴ |
| ۱۱- | مینڈکوں کا الیکشن | ۴۷ |
| ۱۲- | الیکشن کے بعد | ۵۰ |
| ۱۳- | رشوت | ۵۲ |
| ۱۴- | دہلی کی سڑکیں | ۵۶ |
| ۱۵- | جشنِ خیبر | ۵۸ |
| ۱۶- | لاہور کی سڑکیں | ۶۱ |
| ۱۷- | ڈیرہ غازی خاں کا مشاعرہ | ۶۴ |
| ۱۸- | کراچی کے مچھر | ۶۹ |
| ۱۹- | گورخر سے خطاب | ۷۳ |
| ۲۰- | کلیمز فارم | ۷۵ |
| ۲۱- | رنگون کا مشاعرہ | ۷۸ |
| ۲۲- | سگرٹ اور پان کا مکالمہ | ۸۰ |
| ۲۳- | دل لگانے کا دھندہ | ۸۳ |

| عنوان | صفحہ |
|---|---|
| ۲۴- ملاوٹ | ۸۶ |
| ۲۵- گداگری | ۸۹ |
| ۲۶- مارشل لاء | ۹۲ |
| ۲۷- دوسری بیوی | ۹۶ |
| ۲۸- بلیاں | ۹۸ |
| ۲۹- پہلی جنوری | ۱۰۱ |
| ۳۰- سیاسی آزادی | ۱۰۳ |
| ۳۱- شناس نامہ | ۱۰۶ |
| ۳۲- جنرک نیمز | ۱۰۹ |
| ۳۳- سیلاب اور ہم | ۱۱۱ |
| ۳۴- بس کا سفر | ۱۱۴ |
| ۳۵- ہالیجی کا پانی | ۱۱۶ |
| ۳۶- اب اور تب | ۱۱۸ |
| ۳۷- سندھ یونیورسٹی کی فیس | ۱۲۱ |
| ۳۸- پرمٹ | ۱۲۳ |
| ۳۹- پی-آئی-اے سے سفر | ۱۲۵ |
| ۴۰- کے-ایم-سی کی کتا مار مہم | ۱۲۷ |
| ۴۱- مسز روز ویلٹ | ۱۳۰ |
| ۴۲- چاند کا سفر | ۱۳۲ |
| ۴۳- خلا میں بندر | ۱۳۵ |
| ۴۴- آدمی | ۱۳۷ |
| ۴۵- چڑیا گھر | ۱۴۰ |
| ۴۶- سینٹرل انفارمیشن سروس | ۱۴۴ |
| ۴۷- تیل کی دھار | ۱۴۶ |
| ۴۸- ذیابیطس کے مریض | ۱۴۸ |
| ۴۹- ادارۂ یادگارِ غالب کی پنسل | ۱۵۰ |
| ۵۰- سرخ اور سبز پتے | ۱۵۳ |
| ۵۱- بیٹی کا جہیز | ۱۵۵ |
| ۵۲- کاغذ | ۱۵۹ |
| ۵۳- امتحان | ۱۶۳ |
| ۵۴- یکم مئی | ۱۶۶ |
| ۵۵- میں نشے میں ہوں | ۱۶۹ |
| ۵۶- ہارا ہوا لیڈر اور اس کی فریاد | ۱۷۲ |
| سنجیدہ کلام | |
| ۵۷- حورانِ بہشت اور اقبال | ۱۷۷ |
| ۵۸- میر انیس اور مرزا غالب | ۱۸۸ |

# پیش لفظ

سید محمد جعفری کو پہلے ہم نے سنا۔ اب پڑھ رہے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ اب ان کی شاعری دوسرے دور میں داخل ہوئی ہے۔ پہلا دور سماعی روایت سے وابستگی کا دور تھا۔ مطلب یہ کہ ان کی شاعری نے مشاعرے میں آنکھ کھولی۔ وہیں پروان چڑھی اور قبول عام کی سند حاصل کی۔ مشاعرے پھر نجی محفلیں۔ یہیں سے اس شاعری کو پر لگے اور مشاعروں اور نجی محفلوں سے نکل کر اس نے دلوں کو جیتا اور لوگوں کے حافظہ میں جگہ بنائی۔ مگر مشاعروں میں تو اور کتنے شاعروں کا طوطی بولا تھا۔ فرق یہاں سے پیدا ہوا کہ مشاعرے لوٹنے والے دوسرے شاعر اس مقبولیت پر کبھی قانع نہیں ہوئے یا شاید انہیں اپنی اس مقبولیت پر اور خود مشاعرے کے ادارے پر بہت اعتبار نہیں تھا۔ سو انہوں نے اپنے کلام کو چھپوانے کا بھی اہتمام کیا۔ سید محمد جعفری شاید وہ اکیلے شاعر ہیں جنہوں نے اپنی سماعی روایت پر پوری طرح بھروسہ کیا۔ اپنا کلام چھپوانے سے ہمیشہ احتراز کیا۔ پرنٹنگ پریس کے عروج کے زمانے میں اپنی سماعی روایت پر ایسا اعتبار بس انہیں کے حصے میں آیا تھا اور ایسا بھی نہیں ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ پر سوچا ہی نہ ہو۔ نہیں، انہوں نے اس بارے میں سنجیدگی سے سوچا اور سوچ سمجھ کر یہ طے کیا کہ انہیں اپنا کلام چھپوانا نہیں چاہیے۔ ان کے اس نقطۂ نظر کا اظہار ان کی ایک نظم میں ہوا ہے ؎

پوچھتے ہیں مجھ سے کیوں چھپتا نہیں تیرا کلام
تا کہ ہوں آموں کے آم اور گٹھلیوں کے بھی ہوں دام
اور ادب میں بھی معین ہو سکے تیرا مقام
اور تجھے پہچاننے لگ جائیں سارے خاص و عام

اس کے جواب میں ان کا ردعمل دیکھئے جس سے ان کا اس باب میں نقطۂ نظر ہمارے

سامنے آتا ہے۔

چاہتے ہیں پبلشر کے ہاتھ میں میری لگام
احمقوں میں تاکہ شامل ہو سکے میرا بھی نام
کاتبوں اور جلد سازوں کو کروں جا کر سلام
اور اسی صورت سے گزریں زندگی کے صبح و شام
اک اڈیشن چھاپ دے اور پبلشر سوتا رہے
اور مرا خوں جگر دن رات کم ہوتا رہے

یہ تو وہ صورت ہے کہ شاعر ناشر سے معاہدہ کر کے مجموعہ چھپوائے۔ دوسری صورت وہ بھی تو ہے کہ شاعر خود اپنے خرچ اور اپنے انتظام میں مجموعہ چھپوائے۔ جن شاعروں نے اس قسم کا تجربہ کیا ان کا انجام بھی ان کے سامنے تھا۔

میں بھی سرمایہ لگا کر راستہ دیکھا کروں
پھر خوشامد ہر کس و ناکس کی جا بے جا کروں
اور وی پی جو لوٹ آئیں انہیں بھیجا کروں
دستخط کر کر کے پھر دیوان کو بیچا کروں
تاکہ جو تھوڑی بہت عزت ہے ارض پاک میں
خود فروشی کے سبب مل جائے وہ بھی خاک میں

یہ دونوں تجربے ان کے سامنے تھے۔ ان سے انہوں نے نتیجہ یہ نکالا کہ ع

ساتھ میرے بھی وہی ہوگا جو کچھ ہوتا رہا

اور طے کیا کہ عافیت اسی میں ہے کہ جس سماعی روایت سے تم منسلک چلے آتے ہو اسی پر بھروسہ رکھو اور شاعر نے اس فیصلہ پر کس سختی سے عمل کیا کہ جیتے جی کلام کو طباعت کی صورت نہیں دیکھنے دی۔ بیسویں صدی میں پرنٹنگ پریس کے شور کے بیچ سماعی روایت کے ساتھ اس طرح کے ''کمِٹ منٹ''(1) کی شاید یہ واحد مثال ہے۔

---

Commitment (1)

سید محمد جعفری کی سماعی روایت سے یہ وابستگی اپنی جگہ قابل قدر ہے۔ مگر واقعہ یوں ہے کہ ادب کی تاریخ میں خواہ وہ نثر ہو یا نظم سماعی روایت اپنے دن پورے کر چکی۔ اب پرنٹنگ پریس کا دور دورہ ہے اور تحریری روایت کا بول بالا ہے۔ اب کسی شاعر کسی نثر نگار کے لیے اس چلن سے مفر نہیں ہے۔ سو جعفری صاحب کے وارثوں نے دانشمندی سے کام لیا اور ان کے کلام کو چھپوانے کا اہتمام کیا۔ اس سے پہلے ان کا ایک مجموعہ 'شوخیِ تحریر' کے عنوان سے شایع ہو چکا ہے۔ اب ان کا یہ دوسرا مجموعہ ہمارے آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ پہلے مجموعہ ہی سے یہ پتہ چل گیا تھا کہ یہ وہ شاعری نہیں ہے جو مشاعرہ لوٹ کر ہوا میں اڑ جاتی ہے۔ اگر کہیں چھپی ہوئی صورت میں سامنے آئے تو اس کی قلعی کھل جاتی ہے کہ بس اس کی بہار سننے سنانے تک تھی۔ یہاں یہ صورت ہے کہ سطح قرطاس پر بھی منتقل ہو کر بھی اسی طرح زندہ و تابندہ نظر آتی ہے۔ یعنی خالی سننے کی چیز نہیں۔ پڑھنے کی صورت میں بھی اپنا جادو برقرار رکھتی ہے۔ یعنی ہوائی شاعری نہیں ہے کہ ایک کان سے سنا' دوسرے سے اڑا دیا۔ اس کی مار سامعہ سے گزر کر دل و دماغ کی گہرائیوں تک ہے۔

'شوخیِ تحریر' کی اشاعت سے جعفری صاحب کی شاعری میں جو ان کے انتقال کے بعد رفتہ رفتہ پردے میں چلی گئی تھی شاعری کے متوالوں کی پھر سے دلچسپی پیدا ہوئی مگر یہ مجموعہ ایک تشنگی کا احساس بھی چھوڑ گیا۔ پھر اس ایک مجموعہ کے حوالے سے اس شاعری پر اعتماد سے بات کرنا اور کوئی حکم لگانا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ اب اس دوسرے مجموعہ کو ساتھ ملا کر اس شاعری کو پڑھا جائے تو ادھورے پن کا احساس نہیں ہوتا۔ اب شاید بات زیادہ اطمینان اور اعتماد سے کی جا سکتی ہے۔ بلکہ مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ پہلے مجموعہ کے حوالے سے جو کچھ لکھا تھا اس پر اب نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ بعض بیانات تکمیل کا تقاضا کر رہے ہیں۔ بعض میں ترمیم اور افسانوں کی گنجائش نظر آ رہی ہے۔

اس شاعری کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اس کا اپنی شعری روایت سے رشتہ بہت پختہ ہے۔ محض طنز و مزاح والی شاعری سے ہی نہیں بلکہ پوری شعری روایت سے۔ طنز و مزاح والی شعری روایت کے ذیل میں جعفری صاحب پر لکھنے والوں نے اکبر الہ آبادی کا حوالہ بالعموم دیا ہے۔ میں نے بھی دیا ہے مگر اس سلسلہ میں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اکبر الہ آبادی سے جعفری کی شاعری کا رشتہ بس اظہار کی سطح تک ہے۔ یعنی اکبر نے طنز و مزاح کی شاعری کو جو ہنسی دگی کی سطح سے اٹھا کر اسے ایک

فکری سنجیدگی سے روشناس کیا اور شائستگیِ اظہار سے آشنا کیا اسے ان کے بعد اگر کسی شاعر نے صحیح معنوں میں اپنایا تو وہ محمد جعفری ہیں۔ باقی جن معاملات و مسائل سے اس شاعر کو سروکار ہے وہ اکبر کے مسائل و معاملات سے سے مختلف ہے۔ اکبر کو جن مسائل و معاملات سے سروکار ہے وہ تہذیبی ہیں۔ مشرقی تہذیب بالخصوص مسلمانوں کی تہذیبی اقدار بمقابلہ مغربی تہذیب جو چھاتی چلی جارہی ہے۔ اکبر کی شاعری نے اسی تضاد اور تصادم سے غذا حاصل کی ہے۔ محمد جعفری کے یہاں یہ مضموں ذیلی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کا سروکار ان معاملات سے ہے جو سماجی سیاسی نوعیت کے ہیں۔ اہل اقتدار کی خود غرضیاں اور فریب کاریاں‘ ان کی اخلاقی گراوٹ‘ ان کی خوشامد پسندی اور ہوس اقتدار۔ اس سے پیدا ہونے والی سماجی ناانصافیاں اور عوامی مصائب و مشکلات۔ اس موضوع کے حساب سے دیکھیں تو محمد جعفری کی شاعری کا رشتہ اکبر سے کہیں پیچھے جا کر اس شاعر سے ملتا ہے جو اپنی کھری تنقید کی بدولت اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ میری مراد جعفر زٹلی سے ہے۔

وزارتوں کا بننا بگڑنا‘ وزیروں کی آپا دھاپی‘ افسروں کی رشوت ستانی‘ یہ محمد جعفری کے محبوب موضوع ہیں۔ بس انہیں کے بیان میں اہل اقتدار کی خود غرضی‘ نفس پروری اور قوم فروشی کا سارا نقشہ ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔

گرچہ بالکل بے گنہ تھا ہوگیا لیکن وزیر
یعنی ایک جھونکا جو آیا بجھ گئی شمع ضمیر
مفت میں کوٹھی مِلی‘ موٹر ملی‘ پی اے ملا
جب گیا پک نک پہ باہر ٹور کا ٹی اے ملا

وزیر بن گئے۔ اس کے بعد کیا ہوا۔

ملک کا غم ہے نہ ہم کو ملت بیضا کا غم
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم
گرچہ جاہل ہوں پر اتنا جانتا ہوں کم سے کم
ساری دنیا میں اگر کچھ ہے تو انساں کا شکم
اے شکم میرے تنِ فانی کے صدرِ انجمن
”تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن“

وزیروں اور افسروں کے کیا لچھن ہیں، اس سلسلہ کا ایک اور نقشہ دیکھئے۔

یہ کیسا دورہ آن پڑا ہے یونہی یا سرکاری ہے
یہ ملک اور قوم کی خدمت ہے یا لالچ کی بیماری ہے
اے حُبِ وطن سے بیگانے ڈالر سے جو تیری یاری ہے
''گر تو ہے لکھی بنجارہ اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے''
''سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ''
جس محفل میں تو جاتا ہے وہ اہل خرد کی محفل ہے
تو صرف وزارت کرتا ہے اور صرف اسی کے قابل ہے
جو بس کا تیرے کام نہیں اس کام کے اوپر مائل ہے
دورانِ سفر گر ٹوٹ گئی کابینہ جس میں شامل ہے
''سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ''

مگر یہ تو وہ مضمون ہے کہ دریا میں رہ کے مگر مچھ سے بیر۔ سرکاری ملازمت کرتے ہیں اور وزیروں مشیروں افسروں کے ڈھول کا پول کھولتے ہیں۔ پھر بچ کیسے گئے۔ غریب جعفر زٹلی تو ایسی ہی باتیں کرنے پر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اصل میں جعفر زٹلی کا معاملہ یہ تھا کہ اس کے یہاں تلخی بہت تھی اور بقول رشید حسن خاں ''شدید ناگواری یا غصے کا ایک عالم وہ بھی ہوتا ہے کہ جب آدمی بے اختیار ہو کر گالی دے بیٹھتا.... سارے آداب و تکلفات کو بالائے طاق رکھ کے بے نقط سنانے پر اتر آتا ہے۔ جعفر زٹلی کی زٹلیات میں جو شہر آشوب کا پیش خیمہ ہیں یہی واقعہ گزرا ہے۔ انجام گردن سے سر جدا۔ محمد جعفری کی شاعری کا رشتہ اصل میں اسی شاعری سے ملتا ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ جعفری صاحب سارا غصہ پی کر چہرے پہ مسکراہٹ لے آئے ہیں۔ گالی کیا کوئی تلخ جملہ بھی زبان پر نہیں آئے گا۔ لہجہ اتنا میٹھا اور اتنا شائستہ کہ ضرب کتنی ہی شدید ہو مار کھانے والا یہی سمجھے گا کہ پھولوں کی چھڑیاں ماری جا رہی ہیں۔ سو سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی۔ یہ ہے سید محمد جعفری کا فن اور وہ اس فن میں اتنے منجھے ہوئے ہیں کہ دیکھنے سننے والے بھی ہنسیں، جس پہ وار ہوا ہے وہ بھی ہنسے۔ بیشک اس کی ہنسی کھسیانی ہنسی ہو۔ جعفر کی زٹل اور سودا کا شہر آشوب جعفری صاحب کے لہجہ میں ڈھل کر کیا سے کیا بن گیا۔

خیر جعفر زٹلی سے اور سودا سے اور ہاں نظیر اکبر آبادی سے جعفری صاحب کا رشتہ سمجھ میں آتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی خالی اپنے "بنجارہ نامہ" اور "آدمی نامہ" کے حوالے ہی سے اس شاعری میں جلوہ گر نہیں۔ اس کا اپنا خاص لہجہ بھی ان نظموں میں جا بجا اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ مگر غالب اور اقبال تو کسی اور رنگ کے شاعر ہیں ان سے اس شاعری کا رشتہ کیسے پیدا ہوا۔

صرف اتنی بات نہیں ہے کہ جعفری صاحب نے ان شاعروں کے مصرعوں کو اڑایا اور اس خوبصورتی سے اپنے بیان میں ٹانکا کہ دل پھڑک اٹھتا ہے۔ مگر بات اس سے بڑھ کر ہے۔ بالخصوص اقبال کے حوالے سے بلکہ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ جعفری کی شاعری شعرِ اقبال کا توسیعی علاقہ ہے۔ اقبال تو فکر کا شاعر ہے اور جعفری کی شاعری یہ کہتی نظر آتی ہے کہ میں بھی سوچ سے عاری نہیں ہوں۔ اگرچہ میری سوچ آپ کی فکر سے تھوڑی مختلف ہے۔ آپ کی فکر بلندیوں میں پرواز کرتی ہے۔ ادھر میری فکر زمینی حقیقتوں کے دائرے میں حرکت کرتی ہے۔ سو جب اقبال کا آئیڈیلزم محمد جعفری کی کھری حقیقت پسندی سے ضرب کھاتا ہے تو اس قسم کی شاعری جنم لیتی ہے ؎

لاہور میں نہیں ہے رہنے کا گو سہارا
"چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا"
رہتے ہیں اس مکاں میں چھت جس کی آسماں ہے
"خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا"
جن کو مکاں دیئے تھے کہتے تھے اُن سے چوہے
"آساں نہیں مٹانا نام نشاں ہمارا"
دفتر کی شکل یوں ہے جیسے کوئی قفس ہو
"ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا"

آئیڈیلزم اور زمینی حقیقتوں کے ایسے ہی تصادم کا ایک اور نقشہ دیکھئے ؎

الاٹ منٹ ہیں یاروں کی آستینوں میں
نہ ہے زمیں نہ مکاں، لا اللہ الہ اللہ

جو مولوی ہیں وہ کھاتے ہیں رات دن حلوے
بہار ہو کہ خزاں، لا اللہ الہ اللہ

مگر اسی عمل میں ایک مقام وہ آتا ہے جب ان دو شاعروں کے درمیان بہت سنجیدگی کے ساتھ ایک مکالمہ شروع ہو جاتا ہے۔ اچھی خاصی ایک نظریاتی بحث۔ یہ وہ طویل نظم ہے جو ''حورانِ بہشت اور اقبال'' کے عنوان سے لکھی گئی ہے۔ یہاں اقبال کا تصورِ زن زیر بحث ہے۔ اقبال عورت کے بارے میں کیا کہتے ہیں اور محمد جعفری، نہیں محمد جعفری خود نہیں بولتے ان کے کردار بولتے ہیں۔ یعنی وہ حوریں جو کردار بن کر اس نظم میں نمودار ہوتی ہیں اور اقبال کے تصور زن کے روبرو محمد جعفری کے تصور کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہیں۔

بڑھی تیسری حور کرتی یہ شکوہ
کہ صاحب یہ مردانگی تو نہیں ہے
کہ پردے کے عنوان سے شعر لکھ کر
کیا وہ جو ظلم و ستم کے قریں ہے

پھر اقبال کے یہ شعر نقل کرتی ہے ؎

تفاوت نہ دیکھا زن و شو میں میں نے
وہ خلوت نشیں ہے یہ خلوت نشیں ہے

بالکل غلط۔ حور کہتی ہے

تفاوت بہت ہے زن و شو کے اندر
کہ صبر و سکوں شوہروں میں نہیں ہے
جو عورت ہے تصویرِ صبر و وفا ہے
مگر بے وفا مرد حیلہ گزیں ہے

اقبال نے کہا ؎

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

حورتر کی بہ ترکی جواب دیتی ہے۔

صرف آپ کے اشعار سے زن ہوتی ہے نازن
ہے جہل فقط مرگ، نہیں علم و خبر موت

جعفری صاحب کی یہ حوریں آج کی تحریک آزادی نسواں والیوں کی پیش رو معلوم ہوتی ہیں اور آزادی نسواں کے جذبے سے اتنی سرشار ہیں کہ حکیم الاُمّت سے دوبدو ہیں۔ مطلب یہ کہ جس نئے نسائی شعور کا ظہور اب ہمارے یہاں ہوا ہے وہ اب سے پہلے جعفری صاحب کی شاعری میں اپنی جھلک دکھا چکا تھا۔ یہیں سے آپ یہ طے کر سکتے ہیں کہ یہ شاعری خالی خولی ہنسوڑ پن نہیں ہے۔ یہ شاعری نئی فکر کی نقیب ہے جو ایک طرف نئے سیاسی شعور کی قومی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر غمازی کر رہی ہے اور دوسری طرف ہمارے روایتی معاشرتی تصورات کو چیلنج کرتی نظر آتی ہے اور یہیں سے اس شاعری اور آج کل کی مزاحیہ شاعری کے درمیان خط امتیاز قائم ہوتا ہے۔

آج کل کی مزاحیہ شاعری تو ہِر پھر کر بیوی کو اپنا موضوع بناتی ہے۔ وہ جو آپ سے پہلے ہمارے مزاحیہ ادب نے ایک دقیانوسی بیوی کی جھلک ہمیں دکھائی تھی بس اسی کی جگالی کیے چلی جا رہی ہے۔ اس شاعر کو مطلق شعور نہیں کہ تب سے اب تک ہمارے معاشرے میں کتنی تبدیلیاں آ چکی ہیں اور عورت کتنی بدل چکی ہے۔ کچھ بے شعوری، کچھ مردانہ تعصب، دونوں نے مل کر اس کی مزاحیہ شاعری کو پچھلے زمانے کی دقیانوسی بیوی سے بڑھ کر دقیانوسی بنا دیا ہے۔ یہ بات بھی معنی خیز ہے کہ جعفری صاحب کی شاعری میں بیوی سے بڑھ کر شوہر موضوع بنا ہے۔ جو بیوی زیر بحث آئی ہے وہ دوسری بیوی ہے۔ مگر نہیں زیر بحث وہ شوہر جس کا مسئلہ یہ ہے کہ

''دوسری لڑکی سے اب عقد کروں یا نہ کروں''

آخر ہِر پھر کر بیوی ہی کیوں مضحکہ خیز نظر آتی ہے۔ کچھ مضحک طور اطوار شوہروں کے یہاں بھی تو نظر آتے ہیں۔ ایک شوہر کا خاکہ جعفری صاحب کی ایک نظم میں نظر آتا ہے۔ یہ شوہر وہ ہے جو پاکستان کا وزیر اعظم بن گیا تو اسے ہری ہری نظر آئی اور دوسری شادی کی سوجھی

بوگرہ سوچ میں ہیں دل کی بجھے کیسے پیاس
میں جواں بخت ہوں گو عمر ہے اس وقت پچاس

رُخِ روشن پہ بھی اگ آئی ہے ہر قسم کی گھاس
پہلی بیوی ہے جو بننے کو ہے کچھ روز میں ساس
دوسری لڑکی سے اب عقد کروں یا نہ کروں

مطلب یہ ہے کہ یہ شاعری اپنی فکر اور اپنے زبان و بیان دونوں اعتبارات سے ہماری مزاحیہ شاعری کی روایت میں اپنی ایک انفرادیت اور ایک امتیاز قائم کرتی نظر آتی ہے۔ فکری اعتبار سے وہ ایک نئی معاشرتی فکر اور ایک نئے سیاسی شعور کی حامل نظر آتی ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے دیکھیے تو اپنی شعری روایت میں رچی بسی ہونے کے ناتے اس کے اظہار میں ایک رچاؤ، ایک شائستگی پیدا ہوگئی ہے۔ کلاسیکی شعرا اور ساتھ میں جدید شعرا دونوں کو جا بجا اتنا برتا ہے کہ اگر قاری اپنی شعری روایت سے اچھی طرح شناسا نہیں ہے تو کتنے اشارے کنائے اس کے سر سے گزر جائیں گے۔ یعنی یہ شاعری اپنی صحیح تفہیم اور قدردانی کے لیے قاری سے ایک منجھے ہوئے شعری مذاق کا اور اپنی شعری روایت سے شناسائی کا تقاضا کرتی ہے۔

۲۰ / جون ۲۰۰۶ء

انتظار حسین

---

# آئین ۱۹۵۶ء

(یہ نظم اس پس منظر میں پڑھی جائے کہ اُنیس سو پچاس کی دہائی میں کراچی پاکستان کا دارالخلافہ تھا۔ اہلِ کراچی سے مراد وفاقی حکومت ہے)

کیا کریں اے دوست اب اس ملک میں آئین ہے
اور وہ آئین جس کی پشت پر اِک دین ہے
عمر بھر کی عادتوں کے تَرک کی تلقین ہے
غور سے دیکھو تو یہ صورت بہت سنگین ہے

مجھ سے کہتے ہیں بدل دے دفعتاً نظمِ حیات
روزہ رکھ اور ریش رکھ اور پڑھ نماز اور دے زکوٰۃ

یہ بھی کیا دستور ہے جس میں معافی کچھ نہ ہو
خاص لوگوں کے لیے شکلِ اضافی کچھ نہ ہو
محفلِ رنداں میں غیر از چائے کافی کچھ نہ ہو
یعنی قرآں اور سُنّت کے منافی کچھ نہ ہو

شعر وہ کہنا پڑے گا جو نہ ہو الہامیہ
کیونکہ یہ جمہوریہ ہے نام کی اسلامیہ

وہ بھی سن لیں جن کو اپنی شاعری پر ناز ہے
یہ جو ہے، دورِ غزل کی موت کا آغاز ہے
اب وہ لاٹھی چارج ہوگا جو کہ بے آواز ہے
گا سکے گا وہ ہی جو قوّال کا ہم ساز ہے

اب کہاں عشقِ مئے افرنگ و فکرِ عالیہ[1]
جس میں اکثر صرف ہوجاتا تھا ملکی مالیہ

ہوشیار اے دوست اب سُلطانئ جمہور ہے
اب وہی رہبر بنے گا جو بہت مشہور ہے
عقل والا ہے کہ بالکل عقل سے معذور ہے
وہ اناالحق، جب کہے کہیئے کہ یہ منصور ہے

ملک میں آئین کی آئینہ بندی دیکھئے
خواہ اچھی ہو سیاست خواہ گندی دیکھئے

مغربی اور مشرقی یونٹ ہیں پاکستان میں
جیسے دو ہم وزن پلّے عدل کی میزان میں
جس طرح دو کان ہوتے ہیں ہر اک انسان میں
دوسرا سُن لے اگر کہہ دو کسی اِک کان میں

اور ہم اہلِ کراچی ہیں کچھ ایسے بے نوا
دونوں کانوں میں پہنچ سکتی نہیں جن کی صدا

ہیں کراچی میں نہ ہم صحرا نہ ہم دریا میں ہیں
ہیں نہ اِس دنیا کے باہر اور نہ اِس دنیا میں ہیں
صرف مرکز میں ہیں گویا جنّتُ الماویٰ میں ہیں
اور سب ہیں فرش پر ہم عالمِ بالا میں ہیں

اِس لیے جتنے ہیں بنیادی حقوق انسان کے
ہو نہیں سکتے کبھی شایاں ہماری شان کے

الغرض اے دوست اب اِس مُلک میں دستور ہے
اور الیکشن باز چہروں پر بہت ہی نور ہے
یوں تو وہ ہوگا کہ جو اللہ کو منظور ہے
پر وہ ہوسکتا ہے جو وہم و گماں سے دور ہے

یعنی کوئی مولوی ہو جائے گا جس دن وزیر
میرے کندھوں پر بٹھا دے گا کئی مُنکِر نکیر

پارلیمنٹ اور اُس کے دو تہائی حکمراں
بعض بنگالی ہیں جن میں بعض ہیں اہلِ زباں
رشوتیں کِس کِس کو دے انسان کِس کو ڈالیاں[2]
کِتنا پھر خود کھائے اور کتنا ہو نذرِ دوستاں

جِتنی کھا سکتے تھے رشوت اُتنی اب تک کھا گئے
''حسرت اُن غُنچوں پہ ہے جو بِن کھلے مرجھا گئے''

ہوگئی بزنس سے دیکھو نفع خوری الوداع
آئی تھی رشوت میں جو گیہوں کی بوری الوداع
محتسب سے چھپ کے پینا چوری چوری الوداع
صرف سرمائے کے بل پر سینہ زوری الوداع

اے رئیسو اے نوابو اے وڈیرو الوداع
دانہ سب چگ جانے والے اے بٹیرو الوداع

مُلک کے آئین کی سب سے نرالی ہے یہ شان
بولوں بنگالی کہ اردو کیوں ہو کوئی بدگمان
جس طرح کا چاہو اور جس وقت چاہوں دوں بیان
آپ کہہ سکتے ہیں کیا میری اگر ہیں دو زبان

لوگ کرسکتے ہیں آزادی سے اظہارِ خیال
میرزا غالب کا دشمن اب نہ ہوگا کوتوال

انقلاب آیا ہے لیکن کیا حسیں انداز ہے
مغربی یونٹ[3] کا سُنیے کیا سُریلا ساز ہے
جتنے باجے ہیں جُدا ہر ایک کی آواز ہے
ملک میں جمہوریت کے ناچ کا آغاز ہے

خان[4] صاحب کا یہ کابینہ بنانا دیکھنا
دولتانہ[5] اور کھوڑو[6] کا روٹھ جانا دیکھنا

ہم ملازم اُس کو رکھتے تھے جو ہو اپنا عزیز
ہم تھے خاص الخاص آقا اور رَعیّت تھی کنیز
تھے وطن، نسل اور مذہب ملک میں وجہِ تمیز
مفت میں افسوس اب ملتی نہیں ہے کوئی چیز

پہلے جس کو مِل گئی کرسی وہ کہتا تھا کہ اور
کِس کو دیں کرسی اب اِس پر سب کریں گے مِل کے غور

---

(1) ذو معنی محمد علی بوگرہ سابق وزیر اعظم کی دوسری بیوی عالیہ، (2) پھلوں کی ٹوکری، (3) مشرقی پاکستان کی زیادہ آبادی کو مغربی پاکستان کی کم آبادی کے برابر کر کے ون یونٹ بنانا تھا (4)، (5)، (6) (انیس سو پچاس کی دہائی کے صوبہ سرحد، صوبہ پنجاب اور صوبہ سندھ کے ممتاز سیاست دان

## قُربانی کے بکرے

پھر آ گیا ہے ملک میں قربانیوں کا مال
کی اختیار قیمتوں نے راکٹوں کی چال
قامت میں بکرا اُونٹ کی قیمت کا ہم خیال
دِل بیٹھتا ہے اُٹھتے ہی قربانی کا سوال

قیمت نے آدمی ہی کو بکرا بنا دیا
بکرے کو مثلِ ناقۂ لیلیٰ بنا دیا

بکرے کے پیچھے پیچھے ہیں مجنوں کا بھر کے سوانگ
گر ہو سکے خریدیئے بکرے کی ایک ٹانگ
قیمت جو ٹانگ کی ہے لگا دے گی پھر چھلانگ
''مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ''

''ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سَرنوشت کو''
مہنگائی میں چلا ہے یہ بکرا بہشت کو

دیہات سے جو شہر میں بکروں کو لائے ہیں
معلوم ہو رہا ہے وہ جنّت سے آئے ہیں
قیمت نے آسمان کے تارے دکھائے ہیں
بکرا نہیں خریدا گُنہ بخشوائے ہیں

قربانی ایسے حال میں امرِ محال ہے
بکرا ''تمام حلقۂ دامِ خیال ہے''

قربانی ہو بھی جائے مگر کھنچ رہی ہے کھال
اے گوشت کھانے والو ذرا خود کرو خیال
بکرے کے ساتھ ہوتا ہے گاہک کا انتقال
گر قیمتیں یہی ہیں تو جینے کا کیا سوال

ہیں گلّہ بان لوگوں کے پیچھے پڑے ہوئے
اور بکرا لے کے ہم بھی ہیں مُرغے بنے ہوئے

چوراہوں پر کھڑے ہوئے بکروں کے ہیں جو غول
تُو اُن کے مونہہ کو کھول کے دانتوں کو مت ٹٹول
قیمت میں ورنہ آئے گا فوراً ہی اتنا جھول
سونے کا جیسے بکرا ہو ایسا پڑے گا مول

خود ہی کہے گا بکرا کہ تجھ میں اگر ہے عقل
''اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل''

بکرے تمام راہ میں ہنکارتے چلے
بنگلوں کے بیل بُوٹوں پہ منہ مارتے چلے
جس گھر میں گُھس گئے وہیں افطارتے چلے
اور جب ہلے جگہ سے تو سسکارتے چلے

گھر والے کہہ رہے ہیں کہ باہر نکال دو
بکرے مُصر ہیں اِس پہ کہ ڈیرہ ہی ڈال دو

بکرا جو سینگ والا بھی ہے اور فسادی ہے
اُس نے سیاسی جلسوں میں گڑبڑ مچا دی ہے
چلتے ہوئے جلوس میں ٹکّر لگا دی ہے
اور ووٹروں میں پارٹی بازی کرا دی ہے

بکرے ہیں لیڈروں کی طرح جن پہ جُھول[1] ہے
بنکارتے ہیں، چُپ بھی کرانا فضُول ہے

بکرے جو پھر رہے ہیں سڑک پر اِدھر اُدھر
جَلسوں میں اور جُلوسوں میں کرتے ہیں شب بسر
بکرے کی پوری نسل سے بیزار ہیں بشر
جمہوریت کے بکروں کی لے کیا کوئی خبر

ڈر ہے کہ بکرا بھوک کی ہڑتال کر نہ جائے
منحوس سب کے واسطے یہ سال کر نہ جائے

قُربانیوں کا دَور ہے بکروں کی خیر ہو
ہے اور بات حالتِ اِنسان غیر ہو
قرضے میں اُس کا جکڑا ہوا ہاتھ پیر ہو
لیکن نصیب بکرے کو جنّت کی سیر ہو
بکرے کے سر پہ آئے گی شامت ہی کیوں نہ ہو
''اِس میں ہمارے سَر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو''

بکروں کی اِتنی گرمیٔ بازار دیکھ کر
اور قیمتوں کی تیزیٔ رفتار دیکھ کر
بکرا خریدا سستا سا بیمار دیکھ کر
جو مرگیا چُھری پہ ِمری دھار دیکھ کر
میرے نصیب میں نہ تھی قربانی کی خوشی
اِس مصلحت سے کرلی ہے بکرے نے خودکشی

---

## مہنگائی اور عید

آؤ مہنگائی سے ہم اظہارِ بیزاری کریں
بعد اِس کے عید کی جا کر خریداری کریں
ملّتِ بیضا کے حق میں یہ بیاں جاری کریں
تم فقیروں کو نہ دو خیرات، گر زاری کریں

حیثیت سے بڑھ کے لیکن پھونک دو بازار میں
ہوتا آیا ہے یہ ہر نوّاب کی سرکار میں

صَرف کر ڈالیں کمایا ہے جو اِس رمضان میں
بُھول جائیں آپ نے جو کچھ پڑھا قرآن میں
ڈال دیں کیڑے ہر اپنے بھائی کے ایمان میں
تاکہ ہوں رہنے کے قابل ملکِ پاکستان میں

اپنی جو کمزوریاں ہیں اُن پہ یوں ڈالیں نقاب
چوہے اور بلّی کا دیں اِک دوسرے کو ہم خطاب

آؤ اِس رمضاں کی ہر نیکی پہ پانی پھیر لیں
کم سے کم دیں تول میں، قیمت جو ہو اندھیر لیں
اِس طرح لُوٹیں کہ جیسے آندھیوں میں بیر لیں
آؤ پھر ابلیس کو آواز دے کر گھیر لیں

ہو اضافہ کچھ تو مہنگائی کے اِس طوفان میں
فرق مِٹ جائے جو ہے انسان اور حیوان میں

چونکہ میں ہوں ملّتِ بیضا کا تنہا پاسباں
اِس لیے انڈے گراں ہیں اُڑ گئی ہیں مرغیاں
انڈا اور مرغی ہے کیا، ہر جنس ہے جنسِ گراں
آؤ مہنگائی پہ اخباروں میں ہم دے دیں بیاں

کیا کریں جو بات سچّی ہے وہ لب پر آئے ہے
''آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے''

یاالٰہی بخش دے ہم کو کہ ہیں تقصیر وار
تُو گنہگاروں، سیہ کاروں کا ہے پروردگار
کیا کریں، کھاتے ہیں مجبوراً جو ہم سُودی اُدھار
ہر بدعنوانی پہ ہم نے کی ہے توبہ باربار

پوجتے ہیں کچھ تجھے، کچھ اُس بُتِ کافر کو ہم
باری باری توڑتے ہیں توبہ و ساغر کو ہم

---

# کراچی

اے کراچی کھٹمل و کھجلی کے دیرینہ وطن
سب کو یہ دو نعمتیں مِلتی ہیں تجھ سے تحفتاً
اور شہیدِ ناز ہو جاتے ہیں گُلگُوں پیرہن
کب تلک ہم سے تغافل کب تلک بیگانہ پن
سرد مہری اور گرمی کا تری کیا آسرا
سندھ صوبے کی وزارت کی طرح موسم ترا

حُسن تیرا دِلفریب اور دِل سے سب لاچار ہیں
اس لیے تصویرِ محشر کوچہ و بازار ہیں
گو مکانوں کی کمی سے سب زبوُں و خوار ہیں
تیرے عاشق تُجھ پہ مرنے کے لیے تیاّر ہیں
وہ نہ جائیں گے نہ جائیں گے اگر آئے قضا
تو ہی کچھ تدبیر بَتلا کیا کریں میرے خُدا

اوّلاً کوئی مکاں خالی نہیں آتا نظر
اور مکیں دو چار دن کے واسطے جائے اگر
شومیٔ قسمت سے خالی چھوڑ جائے اپنا گھر
سُونگھتے پھرتے ہیں ہمسائے اِدھر کوئی اُدھر
بے تکلّف گھر میں گُھس جاتا ہے یہ کہہ کر ہجوم
''ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم''

پگڑیاں دے کر ترے دربار میں آتے ہیں لوگ
ہاؤس بلڈنگ یونین(2) سے دل کو بہلاتے ہیں لوگ
تیرے دامن پر خیالی قلعے بنواتے ہیں لوگ
رات کو فٹ پاتھ پر ہی تھک کے سو جاتے ہیں لوگ
گردِ غربت میں اُنہیں کوئی نشاں مِلتا نہیں
مسجدیں کم ہیں، خدا کو بھی مکاں مِلتا نہیں

تیرے بازاروں کی رونق اور شہروں میں کہاں
حُسن سے شرما کے بجھ جاتی ہیں اکثر بجلیاں
اِک دلِ وحشی کی خاطر دام ہیں ہر سو نہاں
آ کے بازاروں میں لٹ جاتے ہیں سب پیر و جواں
اور کسی کا بھی نہیں چلتا ہے کوئی داوٴ پیچ
ساری دنیا ہے مریضِ عشق کی آنکھوں میں ہیچ

زاہد و ملا کو یہ باتیں ہیں تیری ناپسند
رہ گُذر میں شُعلہ رُو ڈالیں نگاہوں سے کمند
اُن کی صحت کے لیے یہ سب ہے بے شک سُود مند
خاص کر راشن سے جب ملتی ہے شکّر اور قند

ہیں نمایاں وہ سرِ رہ زور کی لاحول سے
اُن کو بھی اُلفت ہے مجنونوں کے اِس ماحول سے

اور ہوں گے شہر جن میں اُونٹ ہی بدنام ہے
اِس زمیں پر حضرتِ اُشتر کا جلوہ عام ہے
اور ملکوں میں گدھا مجبور ہے ناکام ہے
پر یہاں پر ہر گدھا ہی واجب اِلاکرام ہے

قدرتِ حق دیکھنی ہو تو گدھا گاڑی کو دیکھ
اُس پہ چڑھ کر جا کلفٹن اور کیماڑی کو دیکھ

ٹریم(3) بھی چلتی ہے اور چلتی ہے اِس میں بھیڑ بھاڑ
یوں نظر آتی ہے جیسے جائے انسانوں کا جھاڑ
راستے میں اِن کا کنڈکٹر سے ہوتا ہے بِگاڑ
وہ مُسافر اور ٹکٹ چیکر کی باہم چھیڑ چھاڑ

جیب کتروں کے لیے بھی عیش بے اندازہ ہے
''خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ ہے''

تُجھ میں گاندھی گارڈن[4] اِک سیر گاہِ عام ہے
اور حسینوں کی یہاں پر مجلسِ اَقوام ہے
طائرِ دل جس میں پھنس جائے یہاں وہ دام ہے
ہر نگاہِ فیصلہ کُن موت کا پیغام ہے

بند ہیں پنجروں کے اندر ایسی اقوامِ کہن
مورثِ اعلیٰ جنہیں کہتے تھے مسٹر ڈارون[5]

بس بھی چلتی ہے یہاں پر جیسے چلتی ہے ہوا
جی میں آیا جب چلیں اور جس طرف منہ اُٹھ گیا
راہ میں رُک جائیں گی منظر جو دیکھیں جانفزا
دفعتاً چل کر رُکیں اور رُک کے چل دیں بارہا

سامنے سے گذریں وہ یوں ڈال کر ترچھی نظر
رہ گئے فٹ پاتھ پر عاشق کلیجہ تھام کر

ہیں تیرے نقّار خانے میں بہت سی بولیاں
اُس میں چپ بیٹھی ہے تنہا طوطیٔ شیریں بیاں
یعنی وہ اردو جو ہجرت کرکے آئی ہے یہاں
جنگ آمادہ ہیں اُس بیگم سے گھر کی باندیاں

اُس کی قدرومنزلت سے دِل ترا بیگانہ ہے
''گیسوئے اردو ابھی مِنّت پذیرِ شانہ ہے''

---

(1) ساحل کراچی کی تفریح گاہیں (2) House Building Union (3) Tram (4) کراچی کے چڑیا گھر کا پُرانا نام (5) Darwin، جس نے انسانی ارتقاء کا نظریہ پیش کیا کہ بندر انسان کے مورثِ اولین ہیں

# قائدِ عوام[1]

میں کیا ہوں بس عوام کا میں خیر خواہ ہوں
جمہوریت پسند ہوں اور کج کُلاہ ہوں
ہوں دہریہ کبھی تو کبھی دِیں پناہ ہوں
ہر ایک موومنٹ[2] کا میں سربراہ ہوں
ہوں سوشلسٹ میں تو کبھی سامراجی ہوں
جِس حال میں عوام رکھیں اُس پہ راضی ہوں

ہیں گرچہ یہ عوام ہی میرے دل و جگر
میں اُن سے بے خبر ہوں وہ ہیں مجھ سے بے خبر
رہتا ہوں اُن میں پھر بھی وہ ہیں غائب از نظر
سوتا ہوں دن کے وقت میں، جاگا ہوں رات بھر
دُنیا بھی دِیں بھی چاہیے اِس مخمصے میں ہوں
''یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں''

کہنے کو سارے ملک کے مالک ہیں یہ عوام
اِن کا نہیں ہوا ہے مُعیّن مگر مقام
آجاتے ہیں وہ یاد جو لینا ہو اُن سے کام
مِلتے ہی ورنہ کہتا ہوں وعلیکم السّلام

میں نے ہی بنگلہ دیش کو ناسُور کر دیا
مردُود کر دیا کبھی منظور کر دیا

اِس پاک سرزمین میں اِنساں ہیں پابہ گِل
فوجی حکومتیں ہوں کہ حُکّام ہوں سِوِل
دَلنے کو مُونگ عوام کا سینہ ہے اُن کی سِل
''اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دِل''

یہ جو عوام سائے سے ڈرتے ہیں آج کل
شک اپنے خیر خواہوں پہ کرتے ہیں آج کل

جِس پر عوام ہونے کا ہم کو گمان ہے
مزدور اور طالبِ علم اور کسان ہے
دھوکے پہ دھوکا کھانے کو اِس کی ہی جان ہے
''کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے''

دیکھا ہے میں نے بھاؤ ہر اَفسُوں طراز کا
''یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا''

ٹٹّی کے پیچھے بیٹھ کے کھیلے گئے شکار
بانٹا گیا ہے ریوڑی کی طرح اِقتدار
یاد آئی ہے عوام کی مجھ کو بھی باربار
میں نے بھی کانٹا ڈال کر ان کا کیا شکار
پہچانتا ہوں خوب میں اِن کی سَرِشت کو
میں نے سنوارا وعدوں سے اِن کی بہشت کو

---

(1) ذوالفقار علی بھٹو (2) Movement

# چودہ اگست

(۱۹۶۹ء کی تحریر ہے)

جب کلی دِل کی کِھلی اور جب کُھلا چودہ اگست
یعنی سینتالیس میں پہلے مِلا چودہ اگست
تھا خدا کی رحمتوں کا سلسلہ چودہ اگست
مِل گیا ہم کو وفاؤں کا صِلہ چودہ اگست

جذبۂ حُبّ ِ وطن کی گود کا پالا ہوا
تھا یہی وہ دن کہ جب گوروں کا منہ کالا ہوا

ہم سے بے انصافیاں ہوتی رہیں اور مکر و فن
ماہِ کنعاں قید تھا آزاد گُرگانِ کُہن
لیکن اِس نے ہم کو بخشا جذبۂ حُبّ ِ وطن
ہم تھے اِستحکام کی منزل کی جانب گامزن

اِس حقیقت سے تھے یہ یوسف کے بھائی بے خبر
"پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر"

ہم نے ہر حالت میں شُکرِ ایزدِ باری کیا
صنعت و حرفت کو اپنے مُلک میں جاری کیا
باندھ کر دریا کو کارِ برق برداری کیا
چارہَ افلاس و بیماری و بے کاری کیا
کھیتیوں کو پھر ملا حسن و ترقّی کا چلن
''پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن''

وقت جب بدلا تو ملک اور قوم کا بھی بدلا حال
روشنی میں بدرِ کامل بن گئے نجم و ہلال
اے وطن اے مرکزِ اِکرام و لطفِ ذوالجلال
تُجھ پہ اب ترچھی نظر ڈالے کسی کی ہے مجال
تُو بھی اے چودہ اگست اس کی شہادت دے یہاں
مُلکِ پاکستان ہے بائیس سالہ نوجواں

یہ جواں اب نُورِچشمِ عالمِ اسلام ہے
رات دن بڑھنا ترقّی کی طرف یہ کام ہے
دوستوں کے واسطے اِک امن کا پیغام ہے
دشمنوں کے واسطے شمشیرِ خون آشام ہے
اِس نے توڑا ہے یدِ بیضا سے سحرِ سامری
یہ سیاست میں نہیں کرتا کوئی سوداگری

سربراہی کے لیے کہتی نہیں یہ اس کی خاک
یہ بلاک[1] اچھا ہے اور اچھا نہیں ہے وہ بلاک
آؤ ہم بھی ہاتھ رنگ لیں اور جمائیں اپنی دھاک
''ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک''

ایشیا میں رِہ کے دِکھلاتا نہیں کاریگری
نیک ہے جیسے کہ ہیں سیّد محمّد جعفری

---

Block (1)

## کاغذ کی گرانی

کاغذ گراں ہوا تو بڑا ہی غضب ہوا
اعمال ناموں والا فرشتہ طلب ہوا
اور بارگاہِ غیب سے ارشادِ رب ہوا
کاغذ کی اس کمی کا بتا کیا سبب ہوا

اِس وقت جب زمیں پہ بشر بے لگام ہے
اعمال نامے لکھنے کا کیا انتظام ہے

وہ بولا ہاتھ جوڑ کے اے صاحبِ کرم
کرسکتے ہیں بس اتنا ہی خدمت میں عرض ہم
کاتب سے کہہ دیا ہے کہ باریک ہو قلم
مضمون مختصر کرو بین السطور کم

ملحوظ رکھو رات دن اِس انتظام کو
لِکّھو تو حاشیہ نہ ہو کاغذ میں نام کو

ارشادِ رب ہوا کہ زمیں پر اُتر کے جاؤ
پوچھا گیا جو تم سے اُسی کا جواب لاؤ
کاغذ کی اِس کمی کا سبب کیا ہے یہ بتاؤ
اور یہ کہ نیوز پرنٹ کا کیوں بڑھ رہا ہے بھاؤ

جا کر زمیں پہ مملکتِ پاک دیکھنا!
ہر اک ذخیرہ باز کا اسٹاک دیکھنا!

کہنے لگا فرشتہ کہ اے مالکِ قلم
کاغذ کے کارخانے کو بھی دیکھ آئے ہم
لکڑی کا گُودا کر دیا اُس کے لیے بہم
لیکن ہے اُن دماغوں میں گُودا بہت ہی کم

جِن کو کہ کارخانے میں تو نے بٹھایا ہے
ابلیس نے کچھ ان کو لکھایا پڑھایا ہے

اے خالقِ مصالحِ پیکارِ خیر و شر
کاغذ ہے تیری نعمتِ عظمیٰ زمین پر
لیکن اسے سجاتا بناتا ہے یوں بشر
کاغذ کے پہلوان ہیں ہر فن میں جلوہ گر

کہتا ہے ہجرِ یار میں ملتا نہیں سکوں
''قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں''

---

# پٹرول کی راشننگ

دوسری عالمگیر جنگ ہورہی تھی اور ضرورت کی چیزوں کے پہنچنے پہنچانے کے راستے مخدوش اور ذریعے وسیلے محدود اور مسدود ہوگئے تھے۔ اس زمانے میں یہ خبر آئی کہ باہر کے ملکوں سے پٹرول مزید درآمد کرنا مشکل ہوگیا ہے اور جتنا پٹرول موجودہ حالت میں مل سکتا ہے اسے جنگی کارروائیوں کے لیے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ حکومت برطانیہ کے اہلکاروں نے ملک میں پٹرول کا راشن مُعّین کر دیا۔ شروع شروع میں تو کوپن پہ پٹرول مل بھی جاتا تھا لیکن ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ پٹرول نایاب ہوگیا۔

موٹر نشین تھے جو تجمّل حسین خاں
جوتوں پہ جن کے جمتی نہ تھی گردِ کارواں
پٹرول راشِننگ کی بدولت ہیں نوحہ خواں
اور پا پیادہ پھرتے ہیں چٹخاتے جوتیاں

گرمی ہے اور گرد پسینے میں چُور ہیں
دُوکانیں گھر سے دُور ہیں دفتر بھی دُور ہیں

پٹرول کے نہ ہونے سے مجبور ہوگئے
اور خود ہی اپنی لاش کے مزدور ہوگئے
تلووں میں چھالے قلب میں نا سُور ہوگئے
جو پاس پاس رہتے تھے وہ دُور ہوگئے

موٹر کے ساتھ عشق کی اِک گھات بھی گئی
خُوباں سے ایک وجہِ ملاقات بھی گئی

مِلنا مجھے حسینوں سے دشوار ہوگیا
مُشکل طوافِ کوچۂ دِلدار ہوگیا
پٹرولیم نہ ہونے سے میں خوار ہوگیا
اس پا شِکستگی میں جو دیدار ہوگیا

اُن کی کمر کو پکڑوں کہ اپنی کمر کو میں
''ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں''

پٹرولیم نہ ہونے سے سُونا ہوا دیار
حسرت سے سائیکل کی طرف دیکھتی ہے کار
فالج جو گر پڑا ہے تو روتی ہے زار زار
اور بَیل گاڑیوں سے یہ کہتی ہے بار بار

لے چلیے اماں مجھ کو ہوا خوری کے لیے
مشکل نہیں ہے آپ کے ناگوری(1) کے لیے

اک دُوسرے سے کہتے ہیں لاری کے مالک آج
کاروں سے اُڑ کے لگ گئی ہے لاریوں کو کھاج[2]
اے ڈیزل آئیل آ کے مریضوں کا کر علاج
کب تک کُھلی سڑک پہ ٹرک کا رہے گا راج

اے قبلہ گاہ ایندھنوں کے یعنی کوئلے
جو شَل ہوئے ہیں اُن کی خبر بھی تو کوئی لے

جو مارے مارے پھرتے تھے باحالتِ تباہ
کاروں کے ڈر سے لیتے تھے فٹ پاتھ پہ پناہ
اب سینہ تانے پھرتے ہیں وہ درمیانِ راہ
پیدل یہ چاہتے ہیں کہ بن جائیں بادشاہ

شاطر سڑک کے مالک و مختار ہوگئے
ہم کار کے نہ ہونے سے بے کار ہوگئے

---

(1) ناگوری کے بیل مشہور ہیں (2) کھجلی

# کثرتِ اولاد

سنیئے اِک ناعاقبت اندیش کی فریاد ہے
کہہ رہا ہے وہ مجھے اپنی جوانی یاد ہے
میں جسے کہتا تھا گھر وہ آج طِفل آباد ہے
میری تنہا جان ہے اور کثرتِ اولاد ہے
''اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں''

وہ بھی کیا دن تھے کہ جب یہ مفلسی چھائی نہ تھی
''عاشقی قیدِ شریعت میں'' ابھی آئی نہ تھی
کِس قدر تھے مطمئن گو جیب میں پائی نہ تھی
کثرتِ اولاد کے باعث یہ رُسوائی نہ تھی
''اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں''

کیا خطا میری کہ جو بچّہ ہوا جڑواں ہوا
اور مع ہمزاد عاجز ہی کے گھر مہماں ہوا
میرے گھر آیا تو گویا داخلِ زنداں ہوا
ملک میں غلّے کی قِلّت کا نیا عنواں ہوا
''اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں''

ہوگئے ہیں ایک درجن آج تک لختِ جگر
ایک اِن میں ریفری گیارہ کھلاڑی ہیں مگر
اِس کھلاڑی ٹیم میں فٹ بال ہے اِن کا پدر
اُس کو دوڑاتے ہیں یہ بچّے اِدھر گاہے اُدھر
''اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں''

جا کے پہلے کے لیے موٹی سفارش لاؤں گا
موقع بے موقع اعزّہ کو بہت دوڑاؤں گا
اپنے سارے دوستوں کی جان کو آجاؤں گا
اور کسی دفتر میں اُس کو نوکری دلواؤں گا
''اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں''

دُوسرا بیمار ہے لاؤں گا میں اُس کی دوا
ڈھونڈتا ہوں تیسرے کے داخلے کو مدرسہ
جاکے چوتھے نے جو ہمسائے سے جھگڑا کرلیا
اِس کو نیکی دے، خدا سے کر رہا ہوں یہ دعا
''اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں''

پانچواں ہے اور چھٹا ہے اور پتنگیں اور ڈور
ساتواں ہے، آٹھواں ہے اور نواں کرتے ہیں زور
کوئی بچّہ چیختا ہے اور کوئی کرتا ہے شور
کیونکہ یہ اِک دوسرے کو چھیڑ کر کرتے ہیں بور
''اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں''

ہیں جو دسویں، گیارہویں، دونوں ہیں کندھوں پر سوار
یہ دلا دو، وہ دلا دو کہہ رہے ہیں بار بار
بارھواں بچّہ جو ہے وہ کر رہا ہے ماں کو خوار
رات بھر روتا ہے اس کی گود میں وہ نابکار
''اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں''

گھر میں موٹر بھی برائے بار برداری نہیں
ساتھ لے جانے میں بچوں کے بجز خواری نہیں
ایک بچّہ گود میں لے لوں کہ وہ بھاری نہیں
وہ مگر درجن ہیں، میں انسان ہوں لاری نہیں
''اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں''

بات سچ یہ ہے کہ ہم تھے جس زمانے میں جواں
خاندانی قسم کی منصوبہ بندی تھی کہاں
اور اشیائے ضروری بھی نہ تھیں اتنی گراں
آج میں ہوں اور میری مفلسی کی داستاں
''اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں''

# عید کی اچکن

سجتی تھی کبھی تن پہ جو تھی عید کی اچکن
سجتے تھے کبھی ہم، تو کبھی عید کی اچکن
سو سو طرح پروان چڑھی عید کی اچکن
اب اِتنے گھٹے ہم کہ بڑھی عید کی اچکن

اچکن نہیں اس وقت عبا اور قبا ہے
یا کوئی دو شالہ ہے جو کھونٹی پہ ٹنگا ہے

اِس عید کی اچکن نے مچائی تھی بڑی دھوم
جب اِس کو پہنتے تو چمک اُٹھتا تھا مقسوم
جاتے جو کہیں دُور سے ہو جاتا تھا معلوم
ہم اِس میں نظر آتے تھے جیسے کہ ہوں معصوم

اِس عید کی اچکن میں بڑے لعل جڑے تھے
عیدی بھی ہمیں دیتے تھے جو ہم سے بڑے تھے

اُس عہد میں یہ عید کی اچکن تھی بنائی
جس عہد میں ہم کھاتے تھے بابا کی کمائی
دیتے نہ تھے افلاس کی اُس وقت دُہائی
مِل جاتی تھی جس شے کی ضرورت نظر آئی

ہر بات پہ جب روٹھ کے ہنسنے کا مزہ تھا
تب عید کی اچکن کے پہننے کا مزہ تھا

اِس عید کی اچکن کو پہن لیتے تھے جب ہم
آتی تھی نظر ہیچ ہمیں سلطنتِ جَم
جس نے مجھے دیکھا وہ یہی کہتا تھا ہر دم
''جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِیار کا عالم''

''میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا''
میں بھی غمِ دنیا کا شناور نہ ہوا تھا

اِس عید کی اچکن نے گلے اُن سے ملایا
گھبراتا تھا پاس آنے سے جِن لوگوں کا سایہ
کِس کِس کے نہ جانے بُتِ پِندار کو ڈھایا
جب عید کا دن آیا تو پھر دل کو سجایا

اچکن نہیں ماضی کا سنہرا سا وَرَق ہے
ہم بدلے پر اچکن نہیں بدلی یہ قلَق ہے

اے جعفری اچکن کو نہ لٹکا مِرے آگے
''جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مِرے آگے''
وہ دھوپ ڈھلی رہ گیا سایا مِرے آگے
اب قصۂ ماضی کو نہ دُہرا مِرے آگے

کام آئی یہ اچکن نہ غریبُ الوطَنی میں
''ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں''

---

# مینڈکوں کا الیکشن (۱۹۷۰ء)

یہ سُن چکے ہیں زمانے کے اہلِ فکر و نظر
کہ مینڈکوں کے الیکشن کی اُڑ رہی ہے خبر
ہُوا ہے اُن پہ یہ بیسک[1] ڈیماکرسی کا اثر
ہر ایک کہتا ہے میں ہوں گواہِ خواجہ خضر[2]

ادائے خاص سے ہے نالیوں میں ٹرّاتا
"بنا ہے[3] شہ کا مصاحب[4] پھرے ہے اِتراتا"

ہمارے مُلک میں تھوڑی سی ہوگئی برسات
اِسی پہ بڑھ گئی آپس میں مینڈکوں میں بات
اگرچہ ایک سی حالت ہے سب کی ایک ہی ذات
ہر ایک کرنے لگا پیش اپنے اپنے نکات

اُبل چکے ہیں گٹر اور گڑھوں میں ہے پانی
اندھیری رات ہے اور بولنے کی آسانی

تمام رات الیکشن کا جب چلا چکّر
ملھار گانے لگے مِل کے مینڈک اور جھینگر
الاپنے لگے آواز کے بھروسے پر
اور اُن میں وہ بھی تھے شامل جو تھے اِدھر نہ اُدھر

یہ سب ہیں شُہرت و جمہوریت کے سودائی
مگر خراب ہے اِن مینڈکوں کی بینائی

ہر ایک چھوٹے سے تالاب میں ہے جلسۂ عام
سکون و امن کو دی ہے سزائے حبسِ دَوام
حقوق لینے کو مینڈک اچھل رہے ہیں تمام
ہے کامریڈ کوئی ان میں کوئی پیش امام

یہ نا سمجھ ہیں مگر سب ہیں صاحبِ کردار
یہ دینِ فطرت و حیوانیت کے ٹھیکیدار

اِسی طریقے سے جاگا ہے مینڈکوں کا سماج
سُنا رہا ہے کوئی بھیرویں کوئی کھماج
یہ چاہتے ہیں کہ ہو راج کی بجائے نراج
یہی ہے مذہب و ملّت کے ہر مرض کا علاج

تمام رات کٹی مینڈکوں کی گانے میں
"سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں"

بغیر چیخ پکار اِن کا جب نہ کام ہوا
جو مینڈکی تھی اُسے دفعتاً زکام ہوا
منظّم اُس کا الیکشن پروگرام ہوا
اِسی طرح اسد اللہ خاں تمام ہوا

اور اِس کے بعد بڑھی اور طاقتِ گفتار
الیکشن آیا ہے اور عقل سے نہیں سروکار

---

(1) Basic Democracy ‘ (2) اہلِ پنجاب کا محاورہ ہے ”خواجہ کا گواہ مینڈک“

(3) جنرل یحیٰی خان؛ (4) ذوالفقار علی بھٹو

## الیکشن کے بعد (۱۹۷۱ء)

اِک دوسرے کو کر رہے ہیں آدمی ذلیل
اور آبرو بچانے کی ملتی نہیں سبیل
روشن ہوئی ہے آتشِ نمرود بے دلیل
ملتے نہیں ہیں آگ میں گرنے کو پھر خلیل

پھر شیخ و رند و رہروِ شب ایک ہو گئے
اچھا نہیں ہے جن کا نسب ایک ہو گئے

ہیں سیدھے سادے وقتوں کے سب کاروبار بند
اکثر گدھے کھلے ہوئے ہیں اور کمہار بند
آزاد اِشتہاری ہیں، با اقتدار بند
بلبل بھی پالیسی پہ ہیں کوّوں کی کار بند

مر جائے ایک کوّا تو سب بولیں کائیں کائیں
مل جائیں آدمی تو اُنہیں جیتے جی جلائیں

پھر چھاپہ مارنے کی ہوئی عام تربیت
انسان اور گوریلوں میں ہے اشتراکیت
اُس کی ''گھراؤ'' اور جلاؤ'' کی تھی نیت
اب ناطقہ ہے سر بہ گریبانِ عافیت

شیخ الجبال[1] جس نے کہ برپا کیا فساد
کہتا ہے اب شہید مہاجر سے زندہ باد

مزدور اور کسانوں کا اتنا کِیا خیال
تقریر کی کہ سوڈے کی بوتل کا تھا اُبال
جب دیکھا اقتدار کا ہوتا ہے انتقال
اُس گھر میں جا پڑا جسے کہتے ہیں ہسپتال

بہروپیے نے روپ نرالا سنبھالا ہے
اِس سامری کو گائے کے بچھڑوں نے پالا ہے

نعرے لگانا کام ہے جن کا وہ پیشہ ور
چلتے ہیں اپنے کاندھے پہ بوڑھے کو لاد کر
اِس پیرِ تسمہ پا سے نہیں ہے کوئی مفر
ڈرتے ہیں اِس کے سایے سے حیوان اور بَشر

ڈرتے ہیں جانور کہ وہ لیڈر گذرتا ہے
اپنے سے جو بڑا ہو ہر اِک اُس سے ڈرتا ہے

---

(1) بنگلہ دیش کے سیاسی لیڈر مولانا بھاشانی کی طرف اشارہ ہے جن کے احتجاج کے طریقۂ کار میں ''گھیراؤ'' اور ''جلاؤ'' نمایاں تھے۔ مولانا بھاشانی کو جب اندازہ ہوا کہ وہ شیخ مجیب کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو ہسپتال میں داخل ہو گئے۔

# رشوت

سنا ہے رشوتوں کا خاتمہ ہو جانے والا ہے
یہ نیت کتنی اچھی ہے، یہ جذبہ کتنا اعلیٰ ہے
اگرچہ دستِ غیب اور رشوتوں کا نرخ بالا ہے
قسم لے لو ابھی تک گر زباں سے کچھ نکالا ہے

رسول اللہ کہتے ہیں کہ راشی، مرتشی حتماً
یہی دونوں بنیں گے نارِ دوزخ کے لیے ایندھن

پتنگوں کی طرح رشوت بھی گھٹتی اور چڑھتی ہے
ذرا سا ڈور کو کھینچا تو اور اوپر کو بڑھتی ہے
مگر اِک پیچ پڑ جائے تو کنّی سے اُکھڑتی ہے
ہوَا بگڑے تو جو تدبیر ہو الٹی ہی پڑتی ہے

''غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں''
''جو ہو ذوقِ عمل پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں''

جہاں رشوت مٹانے کا فقط اعلان ہوتا ہے
مگر ذوقِ عمل کا قوم میں فقدان ہوتا ہے
وہیں بڑھتا ہے نرخ اِس کا وہیں بحران ہوتا ہے
وہیں ساحل نہیں ملتا' وہیں طوفان ہوتا ہے

''کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو''
''نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر مونہہ میں زباں کیوں ہو''

اگر ذوقِ عمل ہم سب میں ہو تو کیا یہ مشکل ہے؟
سمجھ لیں سب کہ رشوت اُن کے حق میں سمِّ قاتل ہے
بچیں وہ مُرتَشی سے جیسے وہ طاعون یا سِل ہے
کریں مل کر جہاد اُس پر جو اِس لعنت کا قائل ہے

ہر اک رشوت ستاں کا بند کر دو حقّہ اور پانی
تو دو ہی دِن میں یاد آجائے گی اس شخص کو نانی

اگر بالفرض رشوت ختم ہو جائے تو کیا ہوگا
نہ اوورلوڈ[1] ہوگی بس نہ کوئی حادثہ ہوگا
کسی فٹ پاتھ کے اوپر نہ کوئی خوانچہ ہوگا
نہ ہوگی چور بازاری نہ چوروں کا بھلا ہوگا

جنابِ محتسب ہی جب نہ مے خواری سے باز آئیں
تو کیونکر دودھ والے آب انباری سے باز آئیں

نہ کوئی جیب کترا جیب کترے گا مسافر کی
بدل جائے گی حالت دفعتاً سارے دفاتر کی
یہ بدنامی نہیں ہوگی کسی غلّے کے تاجر کی
کہ غلّہ بھیج کر سرحد سے کیوں دشمن کی خاطر کی

نہیں معلوم کس کس کے کلیجے پر چلے آری
اگر ہوجائے رشوت ختم، مرجائے گا پٹواری

چلائیں گر نہ استادانِ فن رشوت کے انجن کو
اگر آلائشوں سے پاک رکھیں اپنے دامن کو
نہ سن پائے گا پبلک سے کوئی اِس آہ و شیون کو
''رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو''

کچھ ایکس-ای[2]-این بھی کچھ اوورسیر[3] جج کو نکل جائیں
تو کچھ مزدور بھی ایمان کے سانچوں میں ڈھل جائیں

پڑے ہیں جو گڑھے سینوں پر اکثر رہگذاروں کے
جہاں ہوتے ہیں اکثر فیصلے قسمت کے ماروں کے
اٹکتے ہیں جہاں پہیے صبا رفتار کاروں کے
جھٹک دیتے ہیں جوڑ اور بند جو رِکشا سواروں کے

وہ سارے گھاؤ بھر جائیں گے رشوت ختم جب ہوگی
جواب کرتے ہیں ٹھیکیداریاں بن جائیں گے جوگی

نہ ایسا گھی ملے گا جس میں شامل موبل آئیل ہو
نہ مرچوں کا سفوف اینٹوں کا چُورا جس میں شامل ہو
نہ ایسا گوشت ہوگا جو چمر گدھ ہی کے قابل ہو
نہ وہ آٹا کہ لکڑی کا بُرادہ جس کا حاصل ہو

اگر رشوت کے ہر رسیا کا پردہ چاک ہوجائے
تو آمیزش سے پاکستان بالکل پاک ہوجائے

---

(1) Overload ' (2) واپڈا کا عہدہ X.E.N (Executive Engineer)

(3) واپڈا کا عہدہ Overseer

# دہلی کی سڑکیں

جنگ کے زمانے میں امریکی فوجوں کا ایک ہیڈ کوارٹر نئی دہلی بھی تھا۔ امریکن سپاہی نشۂ دولت میں چور دہلی کی سڑکوں پر آوارہ پھرتے تھے۔ یہ لوگ ٹانگے والوں کو بہت فراخدلی سے کرایہ دیتے تھے۔ ٹانگے والے ہندوستانی گاہکوں کو بالعموم ٹانگے پر نہیں بٹھاتے تھے اور کبھی کوئی ہندوستانی بیٹھ جاتا تو نرخ سے تین چار گنا کرایہ طلب کرتے۔ پٹرول کی کمی کی وجہ سے موٹر معمولی آدمی کی دسترس سے باہر تھی۔ دہلی کی طویل سڑکوں پر پیدل چلنا وبالِ جان تھا۔

زلفِ خوباں کی طرح دہلی کی سڑکیں ہیں دراز
اور ٹانگہ ہانکنے والوں پہ ظاہر ہے یہ راز
موٹروں سے کیسے ہوسکتا ہے میرا ساز باز
کاش کہ پٹرول بھی ہوتا شرابِ خانہ ساز

پی کے اِس صہبا کو ہوتیں موٹریں مستِ خرام
میں تو ہوں مردِ مسلماں مجھ پہ پینا ہے حرام

اور اکیلا ہوں بھی تو پیدل چلا جاؤں گا میں
لیلائے محمل نشیں کو کیسے سمجھاؤں گا میں
نَجد کا ناقہ کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں گا میں
پانچ چھ بچوں کو آخر کیسے بہلاؤں گا میں
ایک ہو تو گود میں لے لوں کہ وہ بھاری نہیں
میں مگر انسان ہوں اے دوستو لاری نہیں

ٹانگے والے ہیں سمندِ ناز کے اوپر سوار
آبلہ پائی یہ کہتی ہے کہ اب چلنا ہے بار
دیکھتے ہیں میرے جوتوں کے تَلوں کو جب چمار
''کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب وہ نگاہیں دل کے پار''
چھوڑ کر جوتوں کو چل سکتا نہیں، ہوں ننگے پاؤں
میری یہ حالت ہے بچّہ جس طرح پہنے کھڑاؤں

آ گئے دہلی میں جب سے آدمی پاتال کے
ہو گئے مغرور مالک ہر خرِ دجّال کے
چلتے چلتے ہو گئے خم پاؤں بانکے لال کے
ہم بھی اُجرت میں ٹکے دیتے تو ہیں ٹکسال کے
ہم سے لیکن مل نہیں سکتے اُنہیں آندھی کے بیر
لُوٹتے ہیں اجنبی کو جو دکھا کر ہیر پھیر

---

# جشنِ خیبر

میں خیبر میل سے پیشاور آیا جشنِ خیبر میں
کراچی سے رہا دو رات اک دن پاؤں چکّر میں
مِلے احباب اسٹیشن پہ جب اترا پشاور میں
یہاں سردی سے گرمی آ گئی دل کے سماور(1) میں

مرے دل کا سماور وہ ہے جس میں چاہ بنتی ہے
یہیں افلاس اور الفت کی رسم و راہ چھنتی ہے

تجھے اے جشنِ خیبر میں نے ہر پہلو سے جب جھانکا
نظر آیا سجیلا' حسن والا' دلربا' بانکا
جو کچھ دنیا میں تھا تو نے نمایش گاہ میں ٹانکا
''کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا''

گذشتہ سال سنتے ہیں وہ آئینے دکھاتے تھے
کہ جن میں دیکھنے والے خود اپنا مونہہ چڑاتا تھے

یہاں سرکس ہے جس میں جانور محوِ غلامی ہیں
یہاں ہاتھی ہیں اور گھوڑے بڑے نامی گرامی ہیں
کچھ ان میں آریائی نسل ہیں کچھ ان میں سامی ہیں
جو بکرے ہیں یہاں سرکس میں وہ سب ویت نامی ہیں

دکھاتا ہے یہاں سرکس انوکھے کام کہتے ہیں
اسے اہلِ بصیرت متّحد اقوام کہتے ہیں

دکانوں پر وہ چیزیں ہیں نہیں دیکھی جو خوابوں میں
زمیں پر ماہتاب آئے نظر کالی نقابوں میں
نظر دزدیدہ ڈالو پھنس گئے جب آفتابوں میں
کہ مل جاتے ہیں چپّل بھی یہاں چپلی کبابوں میں

''نمی گویم دریں گلشن گل و باغ و بہار از من''
''بہار از یارو باغ از یارو گل از یارو یار از من''

جہاں اس جشنِ خیبر میں کہیں ٹیلی وژن کھولا
نظر آیا مجھے اس میں یکایک اک حسیں بھولا
مرے کانوں میں آواز آئی کوئی دفعتاً بولا
چلے آؤ چلے آؤ یہی ہے موت کا گولا

کنواں ہے موت کا جس پر مجھے یوسف نظر آیا
مثالِ دیدۂ یعقوب میرا دل ہی بھر آیا

یہاں پر روشنی مینار پر چڑھتی اترتی ہے
نہیں معلوم کن زہرہ جبینوں کو یہ تکتی ہے
یہ میرے دل کی صورت بیقراری میں تڑپتی ہے
وہ دیکھو روشنی سَرکَس کی جو چشمک بھی کرتی ہے

نُمائش کی دکانوں پر ہوا سودا مرے دل کا
''عبادت برق کی کرتا ہوں اورافسوس حاصل کا''

یہ جشنِ خیبر اک حصّہ ہے یوسف کی کہانی کا
سنا ہر سال ہوتا ہے یہ جلسہ کامرانی کا
مجھے یاد آ گیا قِصّہ زلیخا کی جوانی کا
پشاور میں ہوں اب بازار تیری قِصّہ خوانی کا

چراغاں کر کے دل لینے کے فن کی یہ نمایش ہے
''شکیب و صبر اہل انجمن کی آزمایش ہے''

---

# لاہور کی سڑکیں

لاہور حسیں شہر ہے، پر شہر کی سڑکیں
موٹر جو گذر جائے بری طرح سے دھڑکیں
انسان کی صورت نظر آجائے تو بھڑکیں
وہ برگ خزاں دیدہ جو پیروں تلے کھڑکیں

''ہر چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بُڑھاپا''
سڑکوں کو تو اللہ نہ دکھلائے بُڑھاپا

چوبرجی[1] سے آگے سمن آباد[2] کے اندر
قبریں نہیں سڑکیں نہیں معیاد کے اندر
ہیں عہد گذشتہ کے نشاں یاد کے اندر
جس طرح سے شیریں دلِ فرہاد کے اندر

ہر گام زنی اصل میں اک تیشہ زنی ہے
اور صید زبوں کے لیے ناوک فِگنی ہے

بارش جو برس جائے تو بھر جاتا ہے پانی
سڑکوں پہ نظر آتی ہے دریا کی روانی
ٹوٹی کہیں چلتے ہوئے ٹانگے کی کمانی
چلتی ہوئی موٹر میں کہیں گھس گیا پانی

جاتی ہیں یہ سڑکیں مَلک الموت کے گھر کو
اور ڈھونڈھتی پھرتی ہیں مسیحا و خضر کو

چَو بچوّں میں گرتے ہوئے بچوّں کا نظارہ
ہے گورکنوں کا اسی صورت پہ گذارہ
شہراہ پہ ٹھوکر لگی رہگیر پکارا
''شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا''

''ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں
راحت نہیں ملتی کوئی دم آٹھ پہر میں''

جِن لوگوں کے کاشانے کے پہلو سے گذر جائیں
بے غازۂ گرد آئیں تو کس طرح سے گھر آئیں
اور آکے وہ آئینہ اگر دیکھ لیں شرمائیں
ممکن نہیں برسات میں دلدل سے نکل پائیں

عالم کے نشیب اور فراز ان میں عیاں ہیں
دُنیا میں جو چلتے ہیں وہ عقبٰی کو رواں ہیں

اب آیا ہے جمہوریتِ نو کا زمانہ
مِل جائے اگر سڑکوں کو بستی میں ٹھکانہ
ہوجائے گا جینے کے لیے کچھ تو بہانہ
ان سڑکوں سے ہوجائے گا اُدبار روانہ

پھر جائیں گی اُس سمت جدھر جاتی ہیں سڑکیں
اِس وقت تو چلنے سے بھی کتراتی ہیں سڑکیں

---

(1) لاہور کا ایک مقام (2) لاہور کا ایک محلّہ

## ڈیرہ غازی خان کا مشاعرہ

ڈیرہ غازی خاں میں ایک مشاعرے کا دعوت نامہ جو میرے نام آیا تھا اس میں صرف مشاعرے کا ذکر تھا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ریس کے گھوڑوں کی نمائش بھی ہے اور پہلوانوں کا دنگل بھی ہو رہا ہے۔ مشاعرے کے سامعین میں گھوڑوں کے جا کی' پہلوان' پہلوانوں اور گھوڑوں کی مالش کرنے والے بھی موجود تھے۔ اس سے متاثر ہو کر یہ نظم کہی ہے۔

یہ ڈیرہ غازی خاں ہے اور یہاں غازی جو آتے ہیں
وہ ہر چابک سوار اور پہلواں کو یہ بتاتے ہیں
کہ دیکھو شعر یوں پڑھتے ہیں یوں مصرع اُٹھاتے ہیں
یہ کہہ کر شاہبازی عندلیبوں کو سکھاتے ہیں

کہ ہر رسمِ کُہن کا لازمی جب توڑنا ٹھہرا
''وفا کیسی کہاں کا عشق جب سَر پھوڑنا ٹھہرا''

یہاں خُدّام بھی بھاری ہیں اور حُکّام بھی بھاری
کہ غازی خاں کے اِس میلے کی نوعیت ہے سرکاری
ہر اِک شاعر کو لازم ہے کہ چھیڑے راگ درباری
''کہ درویشی بھی عیّاری ہے سلطانی بھی عیّاری''

جبینِ شہریاری پر شکن کی آزمایش ہے
سمندِ طبع شاعر پر رسن کی آزمایش ہے

یہ میلہ ہے یہاں سب پہلواں آپس میں لڑتے ہیں
یہاں شہروں کے بخیے دستِ ناداں سے اُدھڑتے ہیں
تخیّل کے جہاں آباد ہوتے ہیں اُجڑتے ہیں
جو گھوڑے ٹھوکریں کھاتے ہیں نعل اُن کے اکھڑتے ہیں

وہی شاعر چلے گا اس میں جو دُلکی بھی چلتا ہے
الف ہوتا ہے تسلیمات کرتا ہے اُچھلتا ہے

مبارک ہو کہ اُستادانِ فن کی آزمایش ہے
اکھاڑوں میں یہاں نیروئے تن کی آزمایش ہے
صبا رفتار گھوڑوں کے چلن کی آزمایش ہے
اِسی دنگل میں اربابِ سخن کی آزمایش ہے

فری اسٹائل اک طرزِ سخن ایجاد ہوتی ہے
ادب کی بندشوں سے شاعری آزاد ہوتی ہے

یہ شاعر، پہلواں اور ریس کے گھوڑوں کی یک جائی
انہیں اِک اصطبل میں باندھنا ہے عین دانائی
یہ سرکس دیکھ کر خود بول اٹھے گا تماشائی
''نہیں کچھ سبحہ و زُنّار کے پھندے میں گیرائی''
''وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمایش ہے''
فقط پبلک کو خوش کرنے کے فن کی آزمایش ہے

وہ دھوبی پاٹ[1]، بغلی[2]، ٹانگ[3] بل، چورنگ[4] کے ماہر
قیامت تک نہ ہوگا اُن کے اوپر یہ کبھی ظاہر
کہ کِتنا خونِ دل کرتا ہے صرف اِک شعر پر شاعر
لُٹاتا کیا ہے اِک شیریں عروسِ فکر کی خاطر
انہیں منظور دردِ کوہکن کی آزمایش ہے
قلم کے تیشۂ خارا شکن کی آزمایش ہے

اگرچہ شعر پڑھنے آئے وہ جو فن میں کامل تھے
جو فخرِ ہند و پاکستان اُستادوں میں شامل تھے
وہ سب جو کی صفوں کو پھاند جانے کے جو قابل تھے
در آئے بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
یہ ہے بازارِ دُنیا اِس میں ہر فن کی نمائش ہے
''چمن میں خوشنوایانِ چمن کی آزمائش ہے''

جب ایسے سننے والے ہوں کہاں تک کوئی سر پھوڑے
بکثرت تاجرانِ اسپ ہیں نقّاد ہیں تھوڑے
سمجھتے ہیں کہ شاعر بھی ہیں شاید ریس کے گھوڑے
ملی ہے داد یوں کوئی پٹاخہ جس طرح چھوڑے

سخنور اور سخن سنجوں کو یہ عیّاش کہتے ہیں
سمجھ میں شعر آ جائے تو سب شاباش کہتے ہیں

وہ منہ کھولے ہوئے کچھ پہلواں اشعار سنتے ہیں
سمجھ میں کچھ نہیں آتا ہے پھر بھی سَر کو دُھنتے ہیں
طلسماتی جہاں میں پھنس گئے ہیں خواب بُنتے ہیں
یہ طائر آشیاں گم کردہ ہیں تنکوں کو چُنتے ہیں

ہے سہلِ ممتنع میں شعر اک صاحب نے فرمایا
تو سمجھے پہلوانؔ استاد نے اک داوٗ بتلایا

تو شاعر کیا کرے جب اس طرح ہو محفل آرائی
پڑھا مصرع تو گھوڑا ہنہنایا داد یہ پائی
جب ایسے قدرداں ہوں کس طرح ہو نغمہ پیرائی
بچاری شاعری پھرتی ہے اس محفل میں گھبرائی

''قد و قامت'' میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے''
''جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے''

وہ شاعر گھاس جس نے ڈال دی اچھاً ہے اور قابل
جو اچھا گا لیا طوفاں میں اُس کو مل گیا ساحل
اُسے دنگل کا فن آتا ہو یا گھوڑوں میں ہو شامل
کھڑا رہ اے دلِ وابستہ بیتابی سے کیا حاصل

یہاں تُرکی و تازی گامزن کی آزمایش ہے
''شکیب و صبر اہلِ انجمن کی آزمائش ہے''

---

(1) تا (4) کشتی کے داؤں

# کراچی کے مچھر

اے کراچی تیری رونق اور شہروں میں کہاں
مچھروں کی بین الاقوامی نمائش ہے یہاں
کس قدر آباد ہیں تیری نواحی بستیاں
اِن میں مچھّر مہماں ہیں اور مچھّر میزباں

مچھّروں کا شہر میں حفظانِ صحت کا نظام
کر رہا ہے پوری پوری تندہی سے اپنا کام

اور شہروں کے بھی مچھّر ہیں کراچی میں مقیم
کیونکہ اب چلتی نہیں اِس شہر میں بحری نسیم
کر دیا کرتا تھا پسپا مچھروں کو یہ غنیم
تَرک کردی ہے ہواؤں نے بھی اب رسمِ قدیم

مچھروں نے باندھ رکھی ہے کراچی میں ہوا
اِن کے اوپر کارگر ہوتی نہیں کوئی دوا

اے کراچی غیر ملکوں سے جو مچھرؔ آئے ہیں
کیسے کیسے تو نے اُن کے داد رے سنوائے ہیں
رات کو سوتے میں وہ کانوں پہ جب منڈلائے ہیں
اپنے ہی ہاتھوں سے تھپڑ اپنے مونہہ پر کھائے ہیں
اِن کو رشوت بھی اگر دے دیں نہ باز آئیں گے وہ
کاٹ کر چپکے سے تاریکی میں اُڑ جائیں گے وہ

چھوٹے مچھرؔ، موٹے مچھر اور بڑے ہیں اور کھرے
شہر کے بازار اور گھر مچھروں سے ہیں بھرے
رات دن منڈلا رہے ہیں اِن کی فوجوں کے پرے
کان پر گاتے ہیں ٹکرا کر یہ بیجو باورے
مچھروں کو اے کراچی تو نے بخشا ہے وہ چین
خود کو ہر مچھر سمجھتا ہے، وہی ہے تان سین

ہو چکا ہے مچھروں پر خونِ انسانی حلال
کون اِن کو مار سکتا ہے کسی کی کیا مجال
مچھروں کی پرورش کا خاص رکھتے ہیں خیال
آدمی کی جان بچ جائے نہیں اِس کا سوال
آدمی اپنی حفاظت کے اگر قابل نہیں
مچھروں کا خون سر لینے سے کچھ حاصل نہیں

نکلو مچھر دانیاں باندھے ہوئے جب گھر سے جاؤ
زخمی ہوجائے بدن اِتنا زیادہ مت کھجاؤ
جب کوئی مچھر تمہیں کاٹے تو اُس کا دل بڑھاؤ
بلکہ تالی بھی بجاؤ، ساتھ اُس کے مل کے گاؤ
مچھروں پر جاں نثاری کے لیے سچے بنو
اُن کے کچھ مکھن لگاؤ، اُن کے تم چمچے بنو

مچھروں کے کاٹ لینے کا شرف حاصل ہو جب
تُم اگر فریاد لائے لب پہ ہوگی بے سبب
اور لکھا جائے گا تھانے میں بھی نام و نسب
کچھ نہ بولو مونہہ سے کہلاؤ گے ورنہ بے ادب
مچھروں کے پالنے کو کھول رکھے ہیں گٹر
"مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر"

آدمی پر مچھروں کا یہ بڑا احسان ہے
خون پی لیتے ہیں جو سرچشمۂ ہیجان ہے
رات میں بچّوں کا چہرہ اِن کا دسترخوان ہے
اشرف المخلوق مچھر ہے نہ یہ انسان ہے
آدمی مرتے ہیں تو مرجائیں پر مچھر رہیں
شہر کے اندر رہیں اور شہر کے باہر رہیں

مچھروں کو پالنے والی کراچی پر سلام
اِستفادہ کر رہے ہیں مچھروں سے خاص و عام
لڑتے ہیں ناحق جنوبی اور شمالی ویت نام
اس سے تو بہتر ہے انساں مچھروں کے آئیں کام
زندگی انساں کی بے مقصد نہ ہونا چاہیے
یعنی قربانی کی کوئی حد نہ ہونا چاہیے

---

# گورخر سے خطاب (1)

ہم نے مانا کہ یہ مونچھیں ہیں ترے شہپارے
صرف مونچھوں سے مگر کچھ نہیں ہوگا پیارے
ایک ہی دن میں نظر آ گئے دن میں تارے
انتظامات کیے فوج کے بل پر سارے
فوج کا لکھنے کو پھر خطِ غلامی نکلے
تم تو کردار میں خرکارِ عوامی نکلے

جب نہ تھے کچھ بھی تو مزدوروں کے تم تھے لیڈر
گورخر ہو کے نہ تم گور سے نکلے باہر
گولیاں تم نے ہی چلوائی ہیں مزدوروں پر
آخرِ کار وہی نکلے کہ تھا جس کا خطر
اشتراکی تھے بظاہر پہ لٹیرے نکلے
تم کو اندر سے کُریدا تو وڈیرے نکلے

مارشل لا کو یہاں کِس کے لیے یاد کیا
اس نے، تم کہتے رہے، مُلک کو برباد کیا
تم نے گولی سے شفاخانوں کو آباد کیا
تم نے لوگوں کی زباں بندی سے دِل شاد کیا

تم میں لیڈر کی سی شان اور پھبن کچھ بھی نہیں
مونچھ ہی مونچھ ہے چہرے پہ دہن کچھ بھی نہیں[2]

جامعہ[3] میں جو گئے کرنے کو تقسیمِ اسناد
خیر مقدم کیا سب کہنے لگے مردہ باد
تم نکالے گئے کر پائے نہ کچھ بھی اِرشاد
بے سوادی پہ تمہاری کیا ہر شخص نے صاد

تم بیاں دیتے ہو اور خود ہی مُکر جاتے ہو
مونچھیں گُرگابی کے فیتے ہیں تو اتراتے ہو

تم جو ہمدردِ عوامی تھے، بچھایا تھا یہ جال
تم ہی مزدوروں کا کرتے رہے ہو اِستحصال
تم یہ کہتے تھے کہ کیا جمعہ کے دن کی ہڑتال
اور ہفتے میں کسی دن ہو تو پھر دیکھیں کمال

دل کو پتھر کی طرح ہارڈ لیے پھرتے ہو
لب پہ مونچھیں ہیں کہ مُڈگارڈ لیے پھرتے ہو

---

(1) میر رسول بخش تالپور، گورنر سندھ؛ (2) تالپور صاحب کی مونچھیں بہت بڑی تھیں؛ (3) جامعہ کراچی میں تقسیم اسناد

# کلیمز فارم[1]

مجھے جو حِرص نے اک روز بدحواس کیا
کلیمز فارم کے بھرنے پہ دل کو راس کیا
متاعِ رفتہ کی یادوں سے روشناس کیا
گرائی یاس کی ''ی'' اور اُس کو آس کیا

میں شیخ چلّی یہ سمجھا امیرِ اعظم[2] ہوں
کُھلی جو آنکھ تو دیکھا کہ ابنِ آدم ہوں

یہ مُفلسی یہ خیالاتِ عظمتِ ماضی
ہَوِس نے کر لیا عقلِ سلیم کو راضی
نہ مولوی ہوں نہ ہوں محتسب نہ میں قاضی
نہ مجھ کو آتی ہے دورِ زماں کی نبآضی

وہ مجھ سے کہتے ہیں تیرے دماغ میں ہے خلل
کہ جائیداد میں تو لِکھ رہا ہے تاج محل

کلیمز فارم ہے ایک اور پانچ چھ شیڈول
خریدے ہیں اِنہیں خالی بھی چھوڑنا ہے فضول
وہی امیر ہیں جن کا نہیں ہے کوئی اصول
وہ لوگ جانچیں گے دعوے کو جو کریں گے قبول

کلیمز فارم میں لِکھّوں گا میں قطب مینار
اب اُس کو آپ نہ مانیں تو کاٹ دیں سرکار

بتاؤں گا کہ وطن سے نکل کے کیسے جئے
جو صدمہ ہائے گرانمایہ آسماں نے دیئے
نہ دیکھئے گا کہ نقصان جب بیان کیئے
"تو میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیئے"

قلم کو روک لوں کیسے کہ بدمذاقی ہے
وَرق تمام ہوا "جائیداد" باقی ہے

کلیمز فارم کے سینے پہ جب چلا خامہ
تو دیکھئے کہ بپا ہوگا ایک ہنگامہ
کہیں گے کاتبِ اعمال دیکھ کر نامہ
کہ لیڈری کا ہے سر پر اِسی کے عمّامہ

وہ فارم اِس کا نہ تھا اِس نے جو کیا داخل
لگا کے خون شہیدوں میں ہوگیا شامل

میرے کلیمز کا گُل اس لیے نہیں کھِلتا
وکیل جس کو موکّل کہیں نہیں مِلتا
اور اُس کا دامنِ افلاس بھی نہیں سِلتا
کہ عرش ہِلتا ہے اور اُس کا دل نہیں ہِلتا

"نہ قاصدے نہ صبائے نہ مرغِ نامہ برے
کسے نہ بیکسیٔ ما ز تو برد خبرے"

کلیمز فارم جو دفتر میں ہوگئے بھی قبول
پڑے رہیں گے وہاں اور جمے گی اُن پر دھول
جو پانے والے ہیں پہلے ہی کرچکے ہیں وصول
متاعِ بردہ کو رہزن سے چھیننا ہے فضول

میں اپنے شانوں پہ ناحق یہ فرض لیتا ہوں
قبولیت کی توقع پہ قرض لیتا ہوں

جو ناخدا ہو اُسے مردِ باخدا کہیے
جو متقّی ہو اُسے رِند پارسا کہیے
"ہمیں تو خُو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے"
کلیمز فارم کے پیسے نہ ہوں تو کیا کہیے

کلیمز فارم مگر بھر لیے تو کیا ہوگا
"پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا"

---

(1) ہندوستان میں چھوڑے ہوئے اثاثوں کا متبادل حاصل کرنے کے لیے پاکستان میں **Claims Form** بھرنا پڑتا تھا

(2) امیر اعظم ۔ سردار امیر اعظم خان مرکزی کابینہ کے مشہور وزیر تھے جن کی بدعنوانی اور کلیمز کی خرید و فروخت کے بہت قصے مشہور تھے

# رنگون کا مشاعرہ

مجھے رنگون سے جب دعوتِ شعر و سخن آئی
طبیعت فاصلے اور وقت کے چکّر سے گھبرائی
دلِ برگشتہ کو لیکن یہ میں نے بات سمجھائی
"نہیں کچھ سبحہ و زُنّار کے پھندے میں گیرائی"

"وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے"
وہاں رنگینیٔ شعر و سخن کی آزمائش ہے

کراچی سے پیا[1] کی گود میں ہندوستاں آیا
نئی دہلی سے کہنے کو پُرانی داستاں آیا
جوانی کی لیے یادیں میں سُوئے گُلستاں آیا
برائے اہلِ محفل اور بیادِ رَفتگاں آیا

وہ مسکن تھا وہ مدفن ہے بہت سے اہلِ ایماں کا
"وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا"

وہ ایسی سرزمیں ہے جِس میں اہل دل ابھی تک ہیں
جو شیخ و برہمن اُردو کے ہیں قابل ابھی تک ہیں
نشانِ میرؔ و غالبؔ، داغؔ اور سائلؔ ابھی تک ہیں
جو شمعیں بُجھ گئی ہیں رونقِ محفل ابھی تک ہیں

''نمی گویم دریں گلشن گل و باغ و بہار از من''
''بہار از یار و باغ از یار و گل از یار و یار از من''

اُڑا دہلی سے اور اُڑ کر میں کلکتہ میں آ پہنچا
تھکا ہارا ہوا ساحل پہ جیسے ناخدا پہنچا
میں اپنے سننے والوں کے لیے بن کر صدا پہنچا
چلا اردو کی خاطر از کُجا اور تا کُجا پہنچا

مِری اردو تری اُلفت میں اب رنگون آیا ہوں
ترے عشّاق کی محفل میں کچھ مضمون لایا ہوں

---

# سگریٹ اور پان کا مکالمہ

سگریٹ نے یہ اِک پان کے بیڑے سے کہا
تو ہمیشہ سے پری رویوں کے جھرمٹ میں رہا
کون سی ایسی ہیں خدمات تری بیش بہا
خون بہا کیوں لب و دندانِ حسیناں سے لیا
تجھ میں کیا لعل لگے ہیں کہ تو اِتراتا ہے
بے حجابانہ ہر اِک بزم میں آجاتا ہے

سگریٹ سے جو سُنے پان نے یہ تلخ سخن
بولا خاموش کہ اچھا نہیں حاسد کا چلن
جلتے رہنے سے دھواں بن کے مِٹا تیرا بدن
تو لگا مونہہ کو تو غائب ہوئی خوشبوئے دہن
کاغذی پیرہن اور اُس پہ تو فریادی ہے
خود بخود غُصّہ میں جل جانے کا تو عادی ہے

اس پہ سگریٹ نے کہا پان سے یہ کیا ہے ستم
چھاؤں میں پلتا ہے اور تو ہے بڑا سبز قدم
کتھے، چونے پہ، ڈلی پر ترا قائم ہے بھرم
تُجھ پہ چاندی کے ورق لپٹیں تو کیا ہے تجھے غم

خاصدانوں کے محافوں[1] میں سفر کرتا ہے
رات دن ماہ جبینوں میں بسر کرتا ہے

پان بولا کہ جلاتا ہے تو کیوں قلب و جگر
ایشیائی میں ہوں، مغرب کا ہے تو سوداگر
کاش تو اپنے گریبان میں مونہہ ڈالے اگر
تو وہ بے بس ہے کہ ماچس کا جو ہو دست نگر

آگ برسانے میں ساری تری رعنائی ہے
اور یہ چنگاری بھی باہر سے کہیں پائی ہے

بولا سگریٹ کہ بشر شکوہ کناں ہیں تیرے
درودیوار پہ پِیکوں کے نشاں ہیں تیرے
جو لپ اسٹک میں ہیں وہ جلوے کہاں ہیں تیرے
خود تو ہلکا ہے پہ نقصان گراں ہیں تیرے

نہ غذا میں نہ دوا میں ہے تو پھر کون ہے تو
تو ہلاکو ہے کہ تیمور کہ فرعون ہے تو

پان کہنے لگا سگریٹ سے کہ ابلیس لعین
تیری تمباکو سے جاتی ہے بدن میں نکوٹین
تجھ سے پیدا ہوئے امراض نہایت سنگین
بے تمیز اتنا کہ محفل میں جلائے قالین

راکھ سے تیری بھری دیکھتے ہیں ایش ٹرے
کوئی گرنے کو تو گر جائے پر اتنا نہ گرے

جل کے خود سب کو جلا دینا ترا پیشہ ہے
چھپ کے بیٹھی ہے اجل جس میں تو وہ بیشہ ہے
جان لے اپنے ہی عاشق کی جو وہ تیشہ ہے
تیرے پینے سے تو سرطان کا اندیشہ ہے

جو تجھے مونہہ سے لگائیں گے لہو تھوکیں گے
اور بھی چیزوں کے کش لینے سے کب چوکیں گے

صلح اِن دونوں کی آخر میں کرائی میں نے
پان میں ڈال کے تمباکو بھی کھائی میں نے
لب سے سگریٹ کے جو چنگاری اُڑائی میں نے
شعر اور فکر کی شمع اُس سے جلائی میں نے

پان سے میں نے کہا شان تری بالا ہے
تو ہے نوشہ تو یہ سگریٹ ترا شہبالا ہے

---

(1) ڈولی

# دل لگانے کا دھندہ

دنیا کی پہلی تبدیلئ دل (Heart Transplant) آپریشن کی خبر پڑھ کے (جو جنوبی افریقہ میں ہوا)
حادثے میں ہلاک ہوجانے والی ایک نوجوان لڑکی کا دل ایک بوڑھے کو منتقل کیا گیا تھا

سنا اک نوجواں لڑکی محبت کے قرینے میں
گئی دل دے کے اِک بے رحم بُڈھے کے جو سینے میں
مزا آیا اُسے آبِ حیاتِ شوق پینے میں
کہ تھا پچیس سالہ خون دل کے آبگینے میں

کمی کرتے نہیں بوڑھے جواں دل کے اُڑانے میں
بھروسہ کیا کریں دِلبر کسی سے دل لگانے میں

روایت سے بغاوت کا اُٹھا کر جو عَلَم نکلے
وہ بوڑھے ہوگئے اُن کے نہ لیکن پیچ و خم نکلے
اُسی کالے[1] کا دِل جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے
اور اِس پر بھی یہ کہتے ہیں مِرے ارمان کم نکلے

بدلنے لگ گئے گر اِس طرح اعضائے جسمانی
نہ امریکی ہی رہ جائے گا کوئی .اور نہ جاپانی

اگر انگریز کا ہو جسم، اِک حبشی کا چہرہ ہو
ہو آدھا رنگِ رخ کھلتا ہوا اور آدھا گہرا ہو
اگر ڈاڑھی ہو چاندی، رنگ مونچھوں کا سنہرا ہو
کِسی رخسارِ لالہ گوں پہ کالے تِل کا پہرا ہو
بنائی جائے صورت اِس طرح لنکا کے راون کی
کہ اِک مہتر کی آنکھ اور دوسری اُس میں برہمن کی
حسیں ڈرنے لگیں گے کیسے مرمر کے جئے جائیں
ذرا بیمار ہوں اور اُن کے اعضا چور لے جائیں
اگر بادام پستے چشم و لب میں رکھ دیئے جائیں
تو اسمگلنگ کی تہمت ہی میں دلبر دھر لیے جائیں
یہ آوازے لگیں گے عاشقوں کے دل کے سَرجن پر
"تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر"
یہ ناممکن نہیں، ہوں اتفّاق ایسے زمانے میں
بنیں معشوق اردو شاعری کے کارخانے میں
کہ لب غنچہ ہو اور ہوں دانت موتی کے دہانے میں
کمر غائب، صراحی دار گردن پیچ شانے میں
ہو ان کے جسم میں دل کی جگہ پتھر کا اک ٹکڑا
ذقن ہو سیب آنکھیں مثلِ بادام اور دہن ٹکڑا

دماغ اب منتقل بوڑھوں کے شاید ہوں جوانوں میں
ملیں گے پھیپھڑے، گردے، جگر، آنکھیں خزانوں میں
بنیں گے بنک ان کے یہ رہیں گے توشہ خانوں میں
کرایے پر ملیں گے آدمی کے دِل دکانوں میں

یہ دل دینے کی رسم ایسے نہ پڑ جائے زمانے میں
جو خود دِلبر ہیں آئندہ ڈریں وہ دل لگانے میں

اگر ردّ و بدل یوں ہی اصولِ زندگی ٹھہرا
تو اُٹھ جائے گا نسل و رنگ پر اب تک جو ہے پہرا
سفید امریکنوں کے تن پہ اک حبشی کا ہو چہرہ
سفیدی اور سیاہی میں تعلّق ہو بہت گہرا

بدل جائیں گے دورِ زندگی کے سارے پیمانے
یہ نسل و رنگ کے جھگڑے ہوں تاریخوں کے افسانے

---

(1) کالے حبشی النسل

## ملاوٹ

جبکہ آمیزش سے ہر شے آشنا ہوجائے گی
اور ملاوٹ مثلِ دردِ لا دوا ہوجائے گی
اور مُروّت چشمِ انساں سے جدا ہوجائے گی
''محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی''

ملکِ پاکستان ہے جو آج کل خلدِ بریں
ہوگا یہ گندم نُما اور جَو فروشوں کی زمیں

کیا یہ اچھا ہے کہ خالص جنس تو کمیاب ہے
کھوٹ ہے جس میں وہ چلنے کے لیے بیتاب ہے
بورڈ تو سرجن کا لٹکا ہے مگر قصّاب ہے
فیس اتنی، زہرۂ قارون جس سے آب ہے

ٹاٹ کا پیوند ہو جب اطلس و کمخواب میں
حرفِ آخر ہے خلوص اور سادگی کے باب میں

اِس ملاوٹ کا نتیجہ یہ عیاں ہوجائے گا
گھی جو خالص ہو نصیبِ دشمناں ہوجائے گا
صاف آٹا گیہوؤں کا بھی بے نشاں ہوجائے گا
اور خوشامد کے لیے مکھّن گِراں ہوجائے گا

دودھ پانی سے ملا اور پانی پانی ہوگیا
اور جسے کھویا کہا کرتے تھے وہ بھی کھو گیا

موبلِ آئیل کے جو چکنے اور گاڑھے تار ہیں
وہ غذا میں رنگ دینے کے لیے درکار ہیں
کیا ہوا گر اس غذا سے آدمی بیمار ہیں
آدمی کہتا ہے کون اِن کو وہ موٹرکار ہیں

ہو گیا ملکِ عدم کا سہل اب اِن پر سفر
کر دیا تیاّر اِن کو موبل آئیل ڈال کر

اے ملاوٹ کرنے والو اے بنی نوعِ بشر
تم نے مرچوں میں ملا دی ہیں جو اینٹیں پیس کر
اور دواؤں کا مِلاوٹ سے مِٹاتے ہو اثر
کیا کبھی سوچا تمہاری قوم جاتی ہے کدھر

کیا ہے یہ انداز ملک اور قوم کی تعمیر کا
خون گردن پر رہے طفل و جوان و پیر کا

کارِ آمیزش پہ دنیا بھر میں آیا ہے شباب
دل جواں لڑکی کا اِک بوڑھے کے تن میں باریاب[1]
اب تو خالص آدمی مِلتا ہے خارج از حساب
کاروبارِ عاشقی کا ہوگیا خانہ خراب

وہ جو تھے محبوب، دل لیتے ہوئے ڈرتے ہیں وہ
ہاتھ کانوں پر وفا کے نام سے دھرتے ہیں وہ

شامتِ اعمالِ آمیزش ہے دنیا پر سوار
اب نہ گورے کا نہ کالے کا ہے کوئی اعتبار
کیا خبر ہے کونسا حصہ لیا کِس نے اُدھار
تن برہمن کا مگر چمڑے کو دیکھو تو چمار

آدمی مِلنے لگے گا اب تو اِس انداز کا
جِسم واعِظ کا ہے، چہرہ رندِ شاہد باز کا

دیکھیے خود کیا ہیں یہ سیّد محمّد جعفری
دوسروں کے بل پہ جن کی فصل ہوتی ہے ہری
غالب اور اقبال کے اشعار سے نظمیں بھری
اور اِس تضمین کو کہتے ہیں اپنی شاعری

اور یہ تضمین کیا ہے گر نہیں ہے لوٹ مار
اِس کو آمیزش نہیں کہتے تو کیا کہتے ہیں یار

---

(1) دنیا کی پہلی تبدیلی قلب جراحی کی طرف اشارہ ہے۔ جس میں نوجوان لڑکی کا دل ایک بوڑھے کو منتقل کیا گیا تھا۔

## گَداگری

دنیا میں ہر طرف ہے غزلخواں گَداگَری
سَو سَو طرح سے کرتے ہیں انساں گداگَری
نَذرِ خراج و ہدیہٗ سلطاں گَداگَری
ہر مُلک میں سَجاتی ہے دوکاں گَداگَری
شغلِ گَداگَری سے کِسی کو مَفر نہیں
جو اِس سے بچ سکے وہ مَلک ہے بشر نہیں
ہو بادشاہِ وقت کہ اوقات کا فقیر
یہ چاہتا ہے اور زیادہ ہوں میں امیر
رمّال اپنی حرص و ہَوا کا ہُوا اسیر
پڑھتا ہے سب کے ہاتھ کی اپنے سوا لکیر
فن کو گداگری کے ہے ایسا سنوارتا
وہ چاند اور تاروں پہ ہے ہاتھ مارتا

ہر چوک پر گداگروں کا کیسا جال ہے
موٹر رُکی کھڑی ہے کہ سگنل تو لال ہے
یہ اُن گداگروں کے لیے نیک فال ہے
جن سے نکل کے بھاگنا امرِ محال ہے

وقفے میں وہ گداگری سے یوں کمائیں گے
جو کار رُک گئی ہے اُسے کھٹکھٹائیں گے

جشنِ گداگری کہ الیکشن ہے جس کا نام
ہوتا ہے چند سال کے بعد اُس کا اہتمام
ووٹر سے لیڈرز، اُن سے جو ہیں کارکن تمام
اک دوسرے سے مانگتے ہیں بھیک صبح و شام

دُھن ہے گداگری کی سرِ شیخ و شاب میں
"نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں"

کچھ وہ ہیں جن کا پیشۂ ظاہر ہے نوکری
کرتے ہیں ہم غریبوں کے اُوپر وہ افسری
لازم ہر ایک وفد کی ہے اُن پہ ممبری
جاتے ہیں غیر ملکوں میں کرنے گداگری

یہ وہ گدا ہیں شاہ بھی ہیں اور فقیر ہیں
فرعون اپنے گھر میں ہیں باہر حقیر ہیں

وہ بھی گداگری میں ہیں یکتائے روزگار
ہے نوکری کا جن کی خوشامد پہ انحصار
رشوت کے لین دین پہ چلتا ہے کاروبار
افسر کے گرد و پیش جو پھرتے ہیں بار بار

یوں ہی گدھے کو باپ بنا کر گداگری
گوسالے میں جگاتی ہے جادوئے سامری

فنِ گداگری کا ہے یہ بھی حسیں شعار
دل مانگتے ہیں شوخ و ستم پیشہ گلعذار
کہتا ہوں اُن سے مانگتے ہیں دِل جو بار بار
شرمندہ کیجئے نہ مجھے مانگ کر اُدھار

''آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے''
''ہاں کچھ نہ کچھ تلافیٔ مافات چاہیے''

ہے کون احتیاج کی تکلیف سے بری
اپنے خدا سے مانگ جو لینا ہو جعفری
وہ جانتا ہے رسم و رہِ بندہ پروری
جیسا سخی ہو کیجئے ویسی گداگری

جس سے دعا قبول ہو وہ بات چاہیے
''عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے''

# مارشل لاء[1] ۱۹۵۸ء

اِتنی گُذری ہے گراں چیزوں کی ارزانی مجھے
ہوگیا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے
دودھ میں بالکل نظر آتا نہیں پانی مجھے
دل نے کر رکھا ہے محوِ صد پریشانی مجھے
''اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں''

کام دھندہ کچھ نہیں دل کس طرح بہلاؤں میں
کیوں نہ لیڈر بن کے پوری قوم کو بہکاؤں میں
کچھ نہیں دھندہ تو چندہ ہی کروں اور کھاؤں میں
اسکریننگ[2] کی کمیٹی کے نہ ہاتھ آجاؤں میں
''اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں''

سوچتا ہوں پھر کہ حج کر آؤں اسمگلر بنوں
مالِ دِیں اور مالِ دُنیا کا بڑا ڈیلر[3] بنوں
ملک کے باہر بنوں یا ملک کے اندر بنوں
الغرض جو کچھ بنوں میں فوج سے بچ کر بنوں
"اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں"

کیا کریں ہم دل کے ہاتھوں آج کل لاچار ہیں
ملک میں حُکّام سب ہشیار ہیں بیدار ہیں
اِن میں اکثر صاحبِ شمشیرِ جوہر دار ہیں
اور پرانے چودھری بیمار یا بیکار ہیں
"اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں"

بحر کے سینے سے سونا تک اُگلوایا گیا[4]
گندمِ خَلوَت نشیں بازار میں لایا گیا
اور ذخیرہ باز سے چکّی میں پسوایا گیا
نفع خوری کا دوالہ تک نکلوایا گیا
"اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں"

ہائے کشکولِ گدائی لے کے اب جائے گا کون
لال گندم لا کے ہم کالوں کو کِھلوائے گا کون
جس کو امریکی سؤر کھاتے ہیں وہ لائے گا کون
ساتھ میں گندم کے مسٹر گُھن کو پسوائے گا کون
"اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں"

ہائے وہ اُونچے کلیموں کی پہاڑی چوٹیاں
چومتا تھا جھک کے پیشانی کو جن کی آسماں
جو مقامی[5] تھے مہاجر[6] اُن کے مقبوضہ مکاں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں اُن کو وہ بھلا ہیں اب کہاں
"اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں"

ہائے کیا معمور، کیا آباد تھے سب ہسپتال
جن میں بیماروں کے جانے کا نہ تھا کوئی سوال
رات دن آرام کرتے تھے جہاں اہلِ کمال
شعلۂ برقی گرا اور ہوگیا اُن کا وصال
"اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں"

کیا خبر تھی قیمتیں بھی ہوں گی سستی ایک دن
ہوش میں تبدیل ہوگی اپنی مستی ایک دن
یوں مِٹے گی چور بازاری کی ہستی ایک دن
ہوگی شیورلٹ[7] پر ٹولٹ[8] کی تختی ایک دن
"اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں"

غیر ملکی مال کو روتی ہیں اکثر بیویاں
اور ہر امپورٹ کے لائسنس کو اُن کے میاں
غیر بینکوں میں جو دولت ہے وہ آئے گی یہاں
"یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں"
"اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں"

وہ جو تھے یاروں کے یار اک حضرتِ حاجی بلیک[9]
دور سے کہتے سلام اور 'ع' کا گاڑھا علیک
اُن کی بالیں پر بھی آ پہنچا اجل کا تیز پیک
لگ گیا اُن کی بھی چلتی کار کے پہیئے میں جیک[10]
''اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں''

کیوں نہ ایڈیٹر بنوں اخبارِ گوہر بار کا
اور قلم کو رُوپ دوں چلتی ہوئی تلوار کا
ہاتھ میں شَملہ ہو سب اشراف کی دستار کا
مارشل لاء کا مگر پہلا قدم ہے مار کا
''اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں''

یا میں سب کچھ چھوڑ دوں اور چور بازاری کروں
زندگی کی فلم میں ایسی اداکاری کروں
دونوں ہاتھوں سے کما کر عذرِ ناداری کروں
جب حکومت ٹیکس مانگے آہ اور زاری کروں
''اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں''

---

(1) Martial Law ' (2) Screening ' (3) Dealer ' (4) مارشل لاء کے حکام نے سونا جو اسمگلروں نے سمندر میں چھپا دیا تھا وہاں سے نکلوایا تھا ' (5) ' (6) وہ مقامی غیر مہاجرین جنھوں نے خود کو مہاجر ظاہر کیا اور جعلی کلیمز کے ذریعہ متروکہ جائیداد حاصل کی (7) Cheverlet مشہور امریکی کار ' (8) To let (کرائے کے لیے) (9) Black Market کرنے والے کے لیے مروج اصطلاح ' گوجرانوالہ کے تاجر مرحوم آج بھی اس نام سے مشہور ہیں (10) Jack

# دوسری بیوی

(یہ نظم وزیر اعظم پاکستان مسٹر محمد علی بوگرہ کی دوسری شادی کے موقع پر لکھی گئی)

میں جواں بخت ہوں گو عمر ہے اِس وقت پچاس
رُخِ روشن پہ بھی اُگ آئی ہے ہر قسم کی گھاس
اور وہ بیوی کہ جو بننے کو ہے کچھ روز میں ساس
نیک ہے، پر وہ نہیں عشوہ گر و وقت شناس
دوسری لڑکی سے اب عقد کروں یا نہ کروں

حورِ جنّت کی طرح پاک ہے پہلی بیوی
میری نظروں میں مگر خاک ہے پہلی بیوی
میں ہوں نخچیر تو فِتراک ہے پہلی بیوی
آج کل سخت خطرناک ہے پہلی بیوی
دوسری لڑکی سے اب عقد کروں یا نہ کروں

مجھ کو اِس بیوی کے ابّا سے بھی ڈر لگتا ہے
باوا آدم سے بھی، حوّا سے بھی ڈر لگتا ہے
گو خدا سے نہیں، دنیا سے بھی ڈر لگتا ہے
اور سچ بات ہے، اَپوا[1] سے بھی ڈر لگتا ہے
دوسری لڑکی سے اب عقد کروں یا نہ کروں

مجھ کو تعلیم نے مغرب کی سکھایا یہ چلن
ایک دولہا کے لیے چاہیے صرف ایک دلہن
جس سے پیمانِ وفا باندھو، وہ ہو ایک چمن
ایک ہی بیوی ہو انسان کی اور ایک دلہن
دوسری لڑکی سے اب عقد کروں یا نہ کروں

یوں تو اسلام کبھی راس نہ آیا مجھ کو
اور جو مُلاّ ہے اک آنکھ نہ بھایا مجھ کو
عقدِثانی کا جواز اُس نے بتایا مجھ کو
تھا جو شیطان، فرشتہ نظر آیا مجھ کو
دوسری لڑکی سے اب عقد کروں یا نہ کروں

---

(1) اپوا APWA All Pakistan Women's Association

# بلّیاں

جب گھر میں آدھی رات کو آتی ہیں بِلّیاں
ہنڈیا سے بوٹیوں کو چُراتی ہیں بِلّیاں
چوری تو کرنے ساتھ ہی جاتی ہیں بِلّیاں
لیکن اکیلی بیٹھ کے کھاتی ہیں بِلّیاں

پھر بِلّیوں میں ہوتی ہے آپس میں گفتگو
بِلّی ہے اور ماتمِ یک شہرِ آرزو

یوں دل کو شاعروں کے دُکھاتی ہیں بِلّیاں
محفل میں آکے شور مچاتی ہیں بِلّیاں
شاعر کو خود بھی شعر سناتی ہیں بِلّیاں
مصرع کبھی غزل کا اُٹھاتی ہیں بِلّیاں

کرنے کو ہُوٹ کہتی ہیں، میں کیا تمہیں سناؤں
یعنی ہماری بِلّی ہمیں سے کرے میاؤں

ہے بلّیوں کی اپنی سیاست جُدا جُدا
اور اُس کے ساتھ طرزِ عبادت جُدا جُدا
اور آنکھ میچنے کی بھی عادت جُدا جُدا
چڑیاں شکار کرنے کی حالت جُدا جُدا

بیٹھی ہیں ایک گوشے میں پنجوں کو جوڑ کر
سنیاس جیسے لے چکیں، دُنیا کو چھوڑ کر

آنکھیں ہیں بند، سارے زمانے سے بے نیاز
وہ عجز و انکسار ہو انساں کو جس پہ ناز
توبہ کے واسطے کوئی جیسے پڑھے نماز
چڑیا جو آئی سامنے اک جست کی دراز

آیا شکار زد میں تو نقشہ بدل گیا
اُس زُہد و اِتقّا کا جنازہ نکل گیا

ملتا ہے اک بِلاؤ سے جب دوسرا بِلاؤ
کہتا ہے یہ کہ لائے ہو کیا کچھ ہمیں دِکھاؤ
کہتا ہے وہ کہ جاؤ میاں اپنی راہ جاؤ
تم نصف شب میں آکے قلندر کو مت ستاؤ

گستاخیاں نہ کرنا ہماری جناب میں
"ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں"

پہلا بِلاؤ داغنے لگتا ہے پھر بیاں
ہم ہیں بِلاؤ ذات کے اور تیس مار خاں
خالو ہم ہی ہیں شیر کے، سمجھے ہو کیا میاں
اور تم جو آدھی رات کو کرتے ہو چوریاں

بدنام اِس سے ہوتے ہیں سب قوم کے بِلاؤ
بہتر یہی ہے کہ کھاؤ تو ہم کو بھی کچھ کھلاؤ

وہ اِس کو گھورتا ہے جو پہلو بدل بدل
اور چاہتا ہے جلد ہی بوٹی کو لے نِگل
نیچے سُروں میں اِس کو سناتا ہے وہ غزل
بڑھتا ہے پاؤں رکھتے ہوئے پھر سنبھل سنبھل

اک دوسرے کا پوچھنے لگتے ہیں پھر مزاج
حتّیٰ کہ آدھی رات میں جاگ اٹھّے کُل سماج

آتی ہے سب طرف سے صدا ہِشت ہِشت کی
کہتے ہیں بِلّیوں میں ہے چوری سَرِشت کی
اِن کو نہیں لگے گی ہوا تک بہشت کی
ہو شیخ جی کی بِلّی کہ دَیر و کَنِشت کی

ہوتی ہیں بِلّیوں میں بھی کچھ شیخ چِلّیاں
خوفِ خدا سے روتی ہیں راتوں میں بِلّیاں

---

## پہلی جنوری ۱۹۷۰ء
(الیکشن سے متعلق)

آئی پہلی جنوری مُرغوں کا دڑبہ کُھل گیا
لی جو انگڑائی ہر اِک مرغے نے نشّہ دُھل گیا
کرنے ککڑوں کوں بہ زُعمِ نغمۂ بُلبُل گیا
تیز کرلی چونچ اور لڑنے کو بالکل تُل گیا
بعض مرغے سوئے تھے یوں جیسے وہ مُردار تھے
پر وہ سن ستّر کی پہلی صبح کو بیدار تھے
بھول کر اپنی گذشتہ پالیوں کے واقعات
پھر اکھاڑے میں اُتر آئے ہیں کرنے واردات
کچھ تو مرغے ہیں اصیل اور دوغلی ہے کچھ کی ذات
اپنی اپنی نسل ہے اور اپنی اپنی ہیں صفات
اِن کی چونچیں تیز ہیں اور خار اور پنجے بھی ہیں
اِن میں کلغی دار مرغے بھی ہیں اور گنجے بھی ہیں

اِتنی پابندی ہے مُرغوں پر نہ بولیں وہ زباں
جِس کو سُن کر ووٹ دینے سے کُڑک ہوں مرغیاں
اپنا اپنا راگ بھی ہو، اپنی اپنی ڈفلیاں
لیکن اِن مرغوں کا شائستہ ہو لہجہ اور بیاں

ووٹ دینے کے مقدّس فرض کو سمجھیں تمام
اور الیکشن کی جو مرغی ہے نہ ہوجائے حرام

چھوڑ دیں لڑنے میں اب کیچڑ کے استعمال کو
اور یہ سمجھا دیں الیکشن کے ہر اک دلال کو
عیب جوئی میں حریفوں کی نہ کھینچے کھال کو
یاد رکھیّں اپنے اُن گذرے ہوئے اعمال کو

رات دن لڑنے نے اِن مرغوں کو گنجا کردیا
اور مُسلّط اِن کی چونچوں پر شکنجہ کردیا

اپنے اپنے ایک ٹیلے پر ہے مرغوں کا قیام
ان کے گِردوپیش چمچے اور دانہ اور دام
جن کے معنی تک سے ناواقف ہیں لب پر ایسے نام
سوشلزم، اِسلام، اِستعمار، جمہوری نِظام

بعض مرغوں کو تو تقریروں کا ہیضہ ہوگیا
اس لیے اچھا تھا جو گندا وہ بیضہ ہوگیا

---

# سیاسی آزادی

(یحییٰ خان نے مارشل لاء کے بعد الیکشن ۱۹۷۰ء کے لیے سیاسی آزادیوں کا اعلان کیا کہ الیکشن کمپیننگ کی جائے)

اُنیس سو ستّر کی تھی وہ صبح سہانی
لوٹ آئی زلیخائے سیاست پہ جوانی
آزاد ہوا بند سے ہر یوسفِ ثانی
اور خوابوں سے آئندہ کی دہرائی کہانی
کنعان میں پھر قحطِ محبت نظر آیا
اور چہرۂ مِلّت پہ الیکشن نِکھر آیا
جمہور کا ہے رقص یہی پاک الیکشن
قدرت ہے جسے ووٹوں پہ وہ باندھے گا جھانجھن
دِکھلائے گا وہ جشنِ سیاست میں ہر اک فن
یہ مُلک نظر آئے گا پھر ناچ کا آنگن
''بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے''
''ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے''

"سُلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ"
پھر مِل گیا جلسوں کے لیے ایک بہانہ
بنیادی تھیں جمہوریتیں(1) زینتِ خانہ
اب ڈھونڈتی پھرتی ہیں وہ رہنے کا ٹھکانہ
بن جائیں گی وہ میونسپل کارپوریشن
اَب اُن کو صفائی کے لیے ڈھونڈے گی نیشن

"اے خاصۂ خاصان رُسل وقتِ دُعا ہے
اُمّت پہ تِری آ کے عجب وقت پڑا ہے"
اِک ووٹ ہے جس کے لیے ہر دوست کھڑا ہے
سب میرے لیے ایک ہیں چھوٹا نہ بڑا ہے
کس دوست کو میں ووٹ دُوں کِس دوست کو ٹالوں
صورت کوئی ایسی ہو کہ عِزّت تو بچا لوں

اٹھارہ برس سے جو ہیں کم اُن کے مزے ہیں
وہ سرحدِ ادراکِ الیکشن سے پرے ہیں
پھِر ننھّے سے دل زہرِ سیاست سے بھَرے ہیں
جو باغ نظر آتے ہیں اِن کو وہ ہرے ہیں
یارب تو عطا کر دے انہیں صحتِ کامل
اُس وقت تلک جبکہ وہ ہوں بالغ و عاقل

جو شخص ہے لیلائے الیکشن کا فدائی
ووٹوں کے لیے کرتا ہے دَر دَر کی گدائی
اور دیکھ کے ہنستی ہے اُسے ساری خدائی
کہتے ہیں الیکشن نے یہ دُرگت ہے بنائی

ہم پہ جو یہ افتاد ہو ایسا نہ کریں گے
مرجائیں گے ووٹوں کی تمنّا نہ کریں گے

ہر شخص سے کہتا ہے کہ ہُوں آپ کا نوکر
پر شرط ہے وہ شخص الیکشن میں ہو ووٹر
لے جائے گی اور لائے گی گھر تک اُسے موٹر
اور بعد الیکشن کے وہ نوکر ہے یہ سَروَر

ویسے تو کبھی اُن پہ تلطّف نہیں ہوتا
اَیّامِ الیکشن میں تکلّف نہیں ہوتا

---

(1) Basic Democracy یعنی ''بنیادی جمہوریت'' ایوب خان کا جمہوری نظام تھا جو اُن کی اقتدار سے علیحدگی کے فوراً بعد کالعدم ہوگیا

# شناسنامہ[1]

## (NIC)

حضور وہ جو ہمارا شناسنامہ ہے
شناسنامہ نہیں ہے دلائی لامہ ہے
ترس رہا ہے زیارت کو اُس کی ہر انسان
کہ مُدّتیں ہوئی ہیں اُس کو مل چکا نروان
ہُوا ہے ایک برس سے سِوا کہ دی عَرضی
شناسنامہ بنانے کی پر نہ تھی مرضی
گُذاری عرضی دِسمبر میں سن ِتہتّر کے
یہ سن پچھتّر ہوا وہ گِرَو[2] ہے دفتر کے
شناس ناموں کی ناکام ہوگئی اسکیم
کہ پِنڈی[3] والے تو لیٹے ہوئے تھے کھا کے افیم

وہ دفتروں میں چلے کیا مجال ہے اُس کو
کسی طرح بھی سَرکنا محال ہے اُس کو

شناسنامہ بنانے کا جو محکمہ ہے
ڈیپارٹمنٹ نہیں ہے وہ ایک دَخمہ(4) ہے
کہ جس میں پارسی کی لاش ڈال دیتے ہیں
اِسی طریقہ سے حسرت نکال لیتے ہیں

اور اِس کو کہتے ہیں انگریز بُرجِ خاموشی(5)
کہ رہنے والوں کی عادت ہے خوابِ خرگوشی
وہ چاہتے ہیں کہ عرضی کو میری گدھ کھا جائیں
اِسی بہانے سے شاید نجات وہ پا جائیں

کہاں؟ کسے؟ قسمِ سابقہ مروّت دیں
شناسنامہ بنانے کی کس کو رشوت دیں
میں سُن رہا ہوں بغیر اِس کے اب گذر ہی نہیں
شناسنامہ نہیں جِس کا وہ بشر ہی نہیں

گھٹاؤ ملک کی آبادی اور یہ کام کرو
شناسنامہ پہ راشن کا اہتمام کرو
شناسنامہ نہیں جس کے پاس ہے بوگس
نہیں ملے گا جو راشن تو مر ہی جائے گا بس

شناسنامہ سے گر پاسپورٹ ملتا ہے
تو ہم کو ترکِ وطن میں سَپورٹ[6] ملتا ہے
یہ کیا غضب ہے کہ باہر بھی جا نہیں سکتے
اور اپنے ملک کے اندر سما نہیں سکتے

---

(1) قومی شناختی کارڈ' 1973 ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے شناختی کارڈ سکیم کا اجرا کیا جو ہر شہری کے لیے لازمی تھا لیکن اس کے حاصل کرنے میں بہت سی دشواریاں تھیں جبکہ شناختی کارڈ ہر ضرورت مند کے لیے جیسے راشن کارڈ' ڈرائیونگ لائسنس' پاسپورٹ نوکری حاصل کرنے کیلیے ضروری تھا' (2) گرو یعنی رہن رکھنا' (3) وفاقی حکومت' (4) مردوں کا تہ خانہ' (5) Tower of Silence ' (6) support

# جنرک نیمز[1] (Generic Names)

جنرک نیمز نے مِل جُل کے کیا ہم کو تباہ
ہوگئی ہے مَلکُ الموت سے اب یاد اللہ
لو نظر آنے لگی مُلکِ عدم جانے کی راہ
موت برحق سہی، کیا زندہ بھی رہنا ہے گناہ

اب دواؤں پہ نہیں بلکہ دُعاؤں پہ جیو
اِن شتر غمزوں پہ مرجاؤ اداؤں پہ جیو

قیمتیں فیصدی کم ہوگئی ہیں ڈھائی ہزار
یعنی صد روپیہ کردے جو دواؤں پہ نثار
دو صد اور ایک ہزار اُس کو ملیں گے دو بار
حکمِ سرکار ہے تکرار ہے اِس میں بے کار

وہ دوا دے گا جو اِس دور کا قارون بھی ہے
بیچنے والے کا گھر بکنے کا قانون بھی ہے

دیکھو بیمار نہ ہونا، نہیں مر جاؤ گے
چل کے سیدھے ہی تم اللہ کے گھر جاؤ گے
یوں تو رستے سب اُدھر کے ہیں جِدھر جاؤ گے
جنرک نیمز کا پر نام تو کر جاؤ گے

جینا مشکل ہے مگر مرنے میں آسانی ہے
حائل اے چارہ گرو میری گراں جانی ہے

گنڈے تعویذ کی دنیا کو جلال آیا ہے
علم و حکمت پہ مگر وقتِ زوال آیا ہے
اک مریض آج لیے ہڈّی پہ کھال آیا ہے
پر دوا دینے کا اُس کو جو سوال آیا ہے

ہے طبیب آدمی، لِکھّی ہوئی رُوداد نہیں
جنرک نیمز دواؤں کے اُسے یاد نہیں

اب علاج اِس کا جو ہے، ہومیوپیتھک ہوگا
پردہ آنکھوں پہ جو اِس کی ہے بہت تِھک[2] ہوگا
لبِ بیمار پہ نالہ کبھی جِھک جِھک ہوگا
یہ رہِ ملکِ فنا کا کوئی سالِک ہوگا

جو بھی پیدا ہوا اک دن تو اُسے مرنا ہے
جنرک نیمز پہ الزام مگر دھرنا ہے

---

(1) حکومت وقت نے فیصلہ کیا تھا کہ دواؤں کے تجارتی نام خارج کر دیے جائیں اور کیمیائی ناموں کو استعمال کیا جائے۔ (2)Thick موٹا تہہ دار

## سیلاب اور ہم

آیئے کھل کر ذرا سیلاب کی باتیں کریں
ظاہرا ہم اِس کے سدِ باب کی باتیں کریں
گھر میں لیکن ریشم و کمخواب کی باتیں کریں
یعنی اپنی بے حِسی کے خواب کی باتیں کریں

غور کرنا چاہیے کیا چور بازاری کریں
کتنی مہنگائی بڑھا کر مردُم آزاری کریں

ہو چکی ہیں گرچہ اس سیلاب سے فصلیں تباہ
پر گذشتہ سال کی فصلوں کا میں ہوں سربراہ
ہے ہمارے دل کی کیا' بازار ہے پورا سیاہ
میں ذخیرہ بازیوں میں ڈھونڈ لیتا ہوں پناہ

آبرو جس سے بڑھی میری وہ مہنگائی بھی ہے
گرچہ میرے پاس سے دولت گئی آئی بھی ہے

نوح کے طوفان میں بھی اتنی بربادی نہ تھی
اُن دنوں روئے زمیں پر اتنی آبادی نہ تھی
قیمتیں اِتنی بڑھا دینے کی آزادی نہ تھی
جو ہمارے گھر میں تم نے لُوٹ مچوا دی، نہ تھی

بھاؤ چینی کا بڑھایا ایسا تلخی ہوگئی
گھی کو غائب کردیا ایسا کہ خشکی ہوگئی

وہ جو مفلس ہیں وہ روتے ہی رہے شام و سحر
لیکن اس سیلاب نے مجھ پر بھی یہ ڈالا اثر
روک کر رکھّے ہیں میں نے چاول، آٹا، گھی، شکر
''پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر''

ظاہراً سیلاب کے غم میں بہت روتا ہوں میں
ہیں مگرمچھ کے جو آنسو اُن سے مونہہ دھوتا ہوں میں

گر یہی منشائے قدرت ہے تو ٹلوائیں گے کیا
روک تھام آئندہ سیلابوں کی فرمائیں گے کیا
میری ہمدردی سے سب کے پیٹ بھر جائیں گے کیا
''زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا''

نیشنلائز ہوا ہوں میں کسی قابل نہیں
چندہ ہوتا ہو جہاں سمجھو وہاں شامل نہیں

کتنے چھینٹے پڑ چکے ہیں پھر بھی تم جاگے نہیں
تم کو کیا معلوم، تم گھر چھوڑ کر بھاگے نہیں
ٹوٹے وہ رشتے نہیں جو سُوت کے دھاگے نہیں
جانتے ہو اب سمندر کے سوا آگے نہیں

بُجھ گئے سیلاب سے کتنے چراغِ زندگی
''اپنے من میں ڈوب کر پاجا سُراغ زندگی''

چھوڑ دو کیچڑ اچھلوانے کا جتنا کام ہے
''پی پی پی[2]'' اور ''یوڈی ایف[3]'' یہ سب خیالِ خام ہے
کیا خبر ہر ایک تم میں کس لیے بدنام ہے
کیا سیاست اور بیاں بازی کا نام اسلام ہے

اِن سیاست کے بٹیروں کا لڑانا چھوڑ دو
اب عوام النّاس کو اُلّو بنانا چھوڑ دو

---

(1) بھٹو کی طرف اشارہ، (2) پیپلز پارٹی، (3) یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ (مختلف اپوزیشن جماعتوں کا اتحاد)

# بَس کا سفر

اُن ہی سے پوچھتا ہوں میں سفر کرتے ہیں جو بَس میں
کہ دے دیتے ہو اپنی زندگی کیوں غیر کے بس میں

یہ بَس وہ ہے کہ بَس ہو جائے جب موٹر تو بنتی ہے
سڑک پر روٹھ جائے تو بڑی مشکل سے منتی ہے

یہ اکثر بیٹھنے والوں کے دَھکّوں سے کِھسکتی ہے
کبھی کَشتی میں دَریا ہے کبھی دَریا میں کَشتی ہے

سفر کرتے ہیں اس میں جب براتی اور دُلہن دولہا
تو بن جاتی ہے موٹر جائدادِ غیر منقولا

اور اِس کے بعد اگر تاریک ہے شب دُور منزل ہے
تو کرتے ہیں طواف اِس کا وہ مجنوں جن کی محمل ہے

کِلینر سے یہی کہتا ہے شوفر ہو کے بیچارا
''کہ کس نکشود نکشاید بحکمت ایں معمہ را''

اگر اُس وقت میں سردی بھی لگ جائے تو کیا غم ہے
''یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے''
جو رُک جائے رواں کیوں ہو جو بڑھیا ہے جواں کیوں ہو
''ہوئی یہ دوست جن کی دُشمن اُن کا آسماں کیوں ہو''
براتی کھینچتے یہ جائداد آتے ہیں شہروں میں
جو رستہ چند گھڑیوں کا ہے وہ کٹتا ہے پہروں میں
ذرا سے ایک پنکچر سے بگڑتا ہے سنگھار اس کا
ہوا پر جس کی ہستی ہو بھلا کیا اعتبار اس کا
غبار اور گرد کا اور تیل کی بو کا خزینہ ہے
یہ موٹر کار اور ''گدّے'' کی اولادِ نرینہ ہے
ملی گدّے سے رعنائی و زیبائی وراثت میں
خرِ دجّال سے مِلتی ہے صورت میں ملاحت میں
سماتے ہیں پھر اُس میں ٹھس کے یوں بے لطف و آسایش
نہیں رہتی ہے نالوں کے نکلنے کی بھی گنجایش
بسوں کی چھت پہ لد کر دودھ کے برتن جو آتے ہیں
سروں پر شِیر کا بارانِ رحمت وہ گراتے ہیں
وہ ناداں ہیں جو اس بارش پہ ناک اور بھوں چڑھاتے ہیں
صِلے میں سخت جانی کے یہ جوئے شِیر پاتے ہیں
پڑا ہوگا بسوں میں آپ کو ایسوں سے بھی پالا
اُٹھی کُھجلی تو اپنے ساتھ ساتھی کو کُھجا ڈالا

---

# ہالیجی کا پانی[1]

ہالیجی کی گھاس میں چھن کر ہوئی پانی کی دید
مل گئی خوشبو کی سب اہلِ کراچی کو نوید
کے' ڈی' اے[2] نے ہم کو یہ دِکھلا دیا یومِ سعید
اب نہ پیچش میں ہے شِدّت اور نہ چیچک ہے شدید
کھال میں کُھجلی اگر ہوگی تو مرجائیں گے کیا؟
آپ کی تسکین سے یہ زخم بھرجائیں گے کیا؟

چاہتے ہیں لوگ پانی پی کے اِٹھلا کر چلیں!
ہالیجی کی گھاس میں رَکھّی تھیں جیسے بوتلیں
پیٹ کے اندر ہوئیں پانی سے روشن مشعلیں
تاکہ گُردوں اور دل کے ساتھ آنتیں بھی جلیں
کیا عجب دَلدَل سے بھی "گر آفتاب آید بروں"
"ایں قدر مستم کہ از چشم شراب آید بروں"

گو اطبّاء چُپ ہیں لیکن کے ڈی اے کے کُچھ حکیم
جن کے پیشہ ور لقب کے قبل ہے اک لفظ ''نِیم''
کہتے ہیں پانی کے اندر ہے ''کلورینی'' شمیم
ہے یہ ''تَجری مِن تحتھاالانھٰر'' جنّت النعیم
الغرض پانی کے اندر ہے بہت ہی خاص کَیف
''رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف''

یہ جو بڑھتی ہی چلی جاتی ہے آبادی یہاں
رات دن دولہا دلہن کی ہو رہی ہیں شادیاں
زندگی کی ساری اشیائے ضروری ہیں گراں
ان کے کم کرنے کو اب لازم نہیں تیغ و سناں
دو انہیں پانی کے اندر ہومیوپیتھک دوا
کے ڈی اے کا یہ شُترَ غمزہ بھی ہے مہلک ادا

---

(1) کراچی کے پاس جھیل جس سے کراچی کو پانی فراہم کیا جاتا ہے (2) Karachi Development Authority

## ''اَب اور تَب''

(جب سیّد محمدؒ جعفری نے انگریزی ادب میں ایم۔اے کرنے کے لیے
دوبارہ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا اُس وقت یہ نظم لکھی)

نہ پوچھ اے ہمنشیں کالج میں آ کر ہم نے کیا دیکھا
زمیں بدلی ہوئی دیکھی فلک بدلا ہوا دیکھا
نہ وہ پہلی سی محفل ہے نہ مینا ہے نہ ساقی ہے
کتب خانے میں لیکن اب تلک تلوار[1] باقی ہے
وہی تلوار جو بابر[2] کے وقتوں کی نشانی ہے
وہی مرحوم بابر یاد جس کی غیر فانی ہے
زمیں پر لیکچرر کچھ تیرتے پھرتے نظر آئے
اور ان کی ''گاؤن'' سے کندھوں پہ دو شہپر نظر آئے
مگر ان میں مرے استاد دیرینہ بہت کم تھے
جو دو اک تھے بھی وہ مصروفِ صد افکارِ پیہم تھے
وہ زینے ہی میں ٹکرانے کی حسرت رہ گئی دل میں
سنا ''وَن[3] وَے ٹریفک'' ہوگئی اوپر کی منزل میں

اگرچہ آج کل کالج میں واقف ہیں ہمارے کم
ہمیں دیوار و در پہچانتے ہیں اور اُن کو ہم
بلندی پر الگ سب سے کھڑا ''ٹاور'' یہ کہتا ہے
بدلتا ہے زمانہ' میرا انداز ایک رہتا ہے
''فنا تعلیمِ درسِ بے خودی ہوں، اُس زمانے سے''
''کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر''
مگر ''ٹاور'' کی ساعت کے بھی بازو خوب چلتے ہیں
کبوتر بیٹھ کر سوئیوں پہ وقت اُس کا بدلتے ہیں
اُسی مالک کو پھر حلوے کی دعوت پر بلاتے ہیں
وہ حلوہ خوب کھاتے ہیں اُسے بھی کچھ کھلاتے ہیں
اگر وہ یہ کہے اِس میں تو زہریلی دوائی ہے
مرا دِل جانتا ہے اِس میں انڈے کی مٹھائی ہے
پھر اس کے بعد بہرِ خودکشی تیار ہوتے ہیں
وہ حلوہ بیچ میں اور گرد اِس کے یار ہوتے ہیں
وہ پوچھے گر کہاں سے کس طرح آیا ہے یہ حلوہ
تو ڈبّہ پیش کرکے کہہ دیا اِس کا ہے سب جلوہ
کسی کنجوس کے کمرے میں جاکر بیٹھ جاتے ہیں
اور اُس کے نام پر ''ٹک[4] شاپ'' سے چیزیں منگاتے ہیں

بچارہ جعفری مدت کے بعد آیا ہے کالج میں
اضافہ چاہتا ہے اپنے انگریزی کے نالج[5] میں
ترے سینے پہ جب یارانِ خوش آئیں کی محفل ہو
تو اے ''اُووَل[6]'' اُسے مت بھول جانا وہ بھی شامل ہو

---

(1) مسز ابناشی رام تلوار (لائبریرین)'
(2) مرزا بابر بیگ مرحوم (سابق نائب لائبریرین) (3) One Way Traffic' (4) Tuckshop' (5)Knowledge
(6) کالج کی مشہور گراؤنڈ

# سندھ یونیورسٹی کی فیس

(پہلے پہل کراچی یونیورسٹی کو ہی سندھ یونیورسٹی کہا جاتا تھا' سندھ یونیورسٹی حیدرآباد بعد میں قیام پذیر ہوئی)

کراچی شہر کے اندر اگر ذرّے کا دل چیریں
تجارت کی نظر آئیں گی رنگا رنگ تصویریں
کہیں جینے کی تدبیریں کہیں مرنے کی تدبیریں
نگاہِ مردِ ''میمن'' سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

سُنا ہے سندھ یونیورسٹی کی فیس ہے تگڑی
یہاں ہر چیز تب ملتی ہے دی جاتی ہے جب پگڑی

جہاں بچّے ہوں گاہک اور بہت خرّانٹ بیوپاری
وہاں سودے میں لازم ہے بہت کچھ چور بازاری
مسلماں سب برابر ہیں بفضل اِیزدِ باری
یہی وہ مصلحت ہے جس سے اتنی فیس ہے بھاری

جو مفلس ہو اُسے تعلیم دِلوانی ہے ناداری
''چرا کارِ کُندَ عاقِل کہ باز آید پشیمانی''

یہ یونیورسٹی جس کی سَنَد دلوائی جاتی ہے
سُنا ہے اِس میں تعلیم اِس طرح کی پائی جاتی ہے
کہ پہلے زندگی کی کشمکش سکھلائی جاتی ہے
کبھی فیسوں کی خاطر بھیک بھی منگوائی جاتی ہے

جو طالب علم ہیں وہ مانگتے پھرتے ہیں اب چندے
سیاسی لیڈروں کے خود بخود سیکھیں گے وہ دھندے

یہ شاید سندھ یونیورسٹی کا قولِ شافی ہے
کمی فیسوں میں کر دینا شرافت کے منافی ہے
مسلمانوں کو تنہا دولتِ ایمان کافی ہے
خدا کی بارگہ میں سب گناہوں کی معافی ہے

معافی مل نہیں سکتی مگر لڑکوں کو فیسوں میں
وہ لی جاتی ہے یکساں مفلسوں سے اور رئیسوں سے

---

## پَرمِٹ

تقسیم کے کچھ عرصہ بعد تک ہندوپاکستان میں آنے جانے کے لیے پرمٹ دونوں
ممالک کے سفارتخانے دیا کرتے تھے۔ وہ بھی صرف ان لوگوں کو جن کے اعزہ سرحد کے
دونوں اطراف مقیم تھے۔ اس وقت تک پاسپورٹ اور ویزا کی شرائط لاگو نہیں ہوئی تھیں

مقامِ حیرت پہ کارواں ہے نہ کوئی منزل نہ کوئی جادہ
جو چور بازار سے ملے تو خریدیں پرمٹ یہ ہے ارادہ
نہ جانے دیں گے وہ ہم کو دلّی کہ کھانا کھاتے ہیں ہم زیادہ
وہاں ہے گندم کی اتنی قِلّت کہ لوگ کھانے لگے بُرادہ

جو رزق ملتا ہے وہ مِلے گا خدائے رازق کہاں نہیں ہے
دیارِ دہلی کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے

ہے پرمٹ آفس کے آستاں پر نیاز مندوں کا ایک میلہ
کہاں سے پرمٹ خرید لیں جب نہیں ہے بٹوے میں ایک دھیلا
جو پیسے والے تھے جا چکے سب غریب ہی رہ گیا اکیلا
اب اُس کی گاڑی چلے گی ایسے کہ خود چلانے لگے گا ٹھیلا

نیاز مندانِ بزم جاناں کھڑے ہیں مُدّت سے آستاں پر
نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن جگہ زمیں پر نہ آسماں پر

بہت ہی مجبور ہوگئے ہم، تو ہم نے بھی ایک حد بنالی
اب اور بڑھ جائے گی غریبوں کی دونوں ملکوں میں خستہ حالی
یہ لکشمی دیوی کے پوجنے کو عجیب تم نے ادا نکالی
کسی کا گھر جل رہا ہے اور تم سمجھ رہے ہو اُسے دوالی

وہاں بھی پرمٹ یہاں بھی پرمٹ وہ خواہ دہلی ہو یا کراچی
بتاؤ اب گھر بنے بھی کیسے یہاں ہیں چاچا وہاں ہیں چاچی

جہانِ فانی میں خوش رہیں کیا، کہ حُکمِ چرخِ کہن نہیں ہے
یہ کیا کہ پرمٹ نہ دو بُتوں کو اگر یہاں برہمن نہیں ہے
ہمارا دل بھی صنم کدہ ہے اگرچہ وہ بانکپن نہیں ہے
نہیں ہے پہلا سا رنگِ محفل، وہ رونقِ انجمن نہیں ہے

وہ آئے بھی تو کھڑے کھڑے اور دِلوں کو حاصل ہوئی نہ سیری
جو میں نے روکا تو بولے گھبرا کے، میرا پرمٹ ہے ٹمپریری [(1)]

---

Temporary (1)

## پی آئی اے سے سفر[1]

کتنی ہزار فٹ کی بلندی پہ ہے پیا[2]
اور اُس میں جل رہا ہے مری عمر کا دیا
یہ نیلگوں فضا یہ فرشتوں کی کائنات
اور تیرتا ہے اِس میں یہ سرمایۂ حیات
ظاہر زمیں کے چہرۂ رنگیں کے خد و خال
وہ سلوٹیں پہاڑوں کی وہ راستوں کے جال
چاروں طرف اُفق پہ وہ دُھندلی سفیدیاں
اور فرشِ مخملیں پہ وہ بل کھاتی ندّیاں
بادل قدم کے نیچے ہیں قالین کی طرح
نرم و سفید حُسن کی بالین کی طرح
وہ بدلیاں بدلتی ہوئی جن کی صورتیں
پہچانتا ہوں جانی ہوئی صورتوں کو میں

اِن بادلوں میں روحِ بشر گھومتی رہے
سورج کی روشنی بھی انہیں چومتی رہے
کھانا ملا تو ایسا کہ مرغے کی ایک ٹانگ
ٹورسٹ کلاس(3) کہتی تھی تُو اور کچھ نہ مانگ
کافی بھی سرد و گرم کے کچھ درمیان تھی
معشوق بے وفا کی طرح بدگمان تھی
تھا مالٹا وہ جس کی جوانی ہو ڈھل چکی
یا وہ نگاہِ یار جو بالکل بدل چکی

---

(1) Pakistan International Airlines ‘ (2) P.I.A کا اردو مخفف ‘ (3) Tourist Class

# کے ایم سی[1] کی کُتّا مار مہم

وہ مجہول النسب کُتّے جو آوارہ ہوں اور دیسی
سنا ہے اُن کی دشمن ہو گئی ہے اپنی کے ایم سی
وہ کُتّے آدمی سے کاسہ لیسی جن کی ملتی ہے
خوشامد میں زباں چلتی نہیں پر دُم تو ہلتی ہے
محلے کو یہ کُتّے پکّا گانا بھی سناتے تھے
مسافر اور فقیر آئے تو اس کو کاٹ کھاتے تھے
وہ کُتّے اپنے ہم جنسوں کے ہیں جو دشمنِ جانی
مگر ہے خاصیت اُن کی وفائے نوعِ انسانی
نجس ہے اس لیے کتا کہ ہم جنسوں سے لڑتا ہے
اگر انساں نظر آئے تو اُس کے پاؤں پڑتا ہے
انہیں اپنوں سے نفرت اور بیگانوں سے اُلفت ہے
وہ جاسوسی بھی کر لیتے ہیں یہ ان کی جبلّت ہے

ہیں بالکل بے خبر اِس سے کہ جس انساں سے کی یاری
اُنہیں اب زہر دے دینے کی وہ کرتا ہے تیاّری
عقیدت سے قدم بوسی کا یہ بدلہ ملا اُن کو
کہ زہر آلود بوٹی دی گئی بہرِ غذا اُن کو
وہ کُتّے رات بھر جو جاگتے تھے دن میں سوتے تھے
اندھیری شب میں جو سُوئے فلک منہ کرکے روتے تھے
وہ کُتّے شہر کی گلیوں میں جو محفل سجاتے تھے
یہ کُتّے جو کبھی گاتے کبھی مصرع اُٹھاتے تھے
دوغزلے اور سہ غزلے دن میں کُتّے کہہ کے لاتے تھے
شبِ تاریک میں پھر سونے والوں کو سناتے تھے
کہا کُتّے نے نصفِ شب میں مطلع عرض ہے یارو
کٹے گی کیسے شب، تو شعر پڑھنا فرض ہے یارو
جوابِ آں غزل کو ایک کُتّے نے یہ فرمایا
کہ اہلِ ذوق کے سینوں کو جس نے خوب گرمایا
نہ ہوگی متحد اقوامِ کلبی اب وہ پہلی سی
ہے کُتّے مارنے کی انجمن کا نام کم ایم سی
وہ کُتّے جو غلاموں کی طرح ہڈّی پہ لڑتے تھے
نہیں اِن کا کوئی مالک مگر پھر بھی اکڑتے تھے

وہ کُتّے جو گلی میں اکثر اپنی شیر ہوتے ہیں
جہاں باہر سے کُتا آ گیا اندھیر ہوتے ہیں
گلی میں غیر کُتّے کو تگڈم کر کے یوں مارا
کہ جیسے لڑ رہے ہوں ملک پر اسکندر و دارا
یہ کہتا ہے وہ کُتا سر پہ جو کالر نہیں لادا
''دِلم در عاشقی آوارہ شد آوارہ تر بادا''
الٰہی اپنی بھی دنیا ہے کُتّوں کی ہے جو دُنیا
ترے آزاد کُتّوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دُنیا

---

## مسز رُوزویلٹ[1]

کراچی میں آئیں مسز رُوز وَیلٹ
رکھے اپنے بالوں پہ ہلکی سی فیلٹ[2]
خوشامد در آمد کراتی ہُوئی
مِرے حاکموں کو نچاتی ہوئی
گداؤں نے رو رو کے اُس سے کہا
''کریما بہ بخشائے بر حالِ ما''
وہ بولیں کہ اے مُفلسانِ ازل
تمھاری ہر اِک بات ہے بے محَل
ثبوتِ وفا ہو جو کوئی تو لاؤ
نہیں چلتی پانی میں مصری کی ناؤ
اگر بیچ دو میرے ہاتھ اپنی روح
تو ہو یوٗ ایس اے[3] کی مُیسّر صبوح

دِلاؤں گی انسانیت کے حقوق(4)
چٹاؤں گی دنیائے نو کا لعوق(5)
دِلادوں گی ایران سے تم کو تیل
اگر ہو ہر اِک اشتراکی کو جیل
سُنا ہے یہاں عورتیں ہیں غلام
مسلماں نے بخشا ہے حبسِ دوام
کَرو اِن کو آزاد اور بے لگام
کہ دنیائے تہذیب ہے' اِس کا نام
عبث کوئی ڈالر لُٹاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
نہیں جانتے چین کے چیانگ(6) کو
نبھایا بہت ہم نے اِس سَوانگ کو
وہ دِل کو بڑھا کر گئیں اِنڈیا
کہ ہے معتقد جس کا سَب ایشیا
یہاں ہم بغل جھانکتے رہ گئے
یونہی دُھول سی پھانکتے رِہ گئے
یہ رِنانوے کا عجب پھیر ہے
''مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے''

---

(1) امریکی صدر فرینکلن روز ویلٹ (Franklin Roosevelt) کی بیوہ' اہم مشہور سوشل ورکر برائے حقوق خواتین' (2) Felt ایک قسم کا ہیٹ (3) U.S.A' (4) مسز روز ویلٹ 'Human Rights' کی علم بردار تھیں' (5) چاٹنے کی دوا' (6) چیانگ کائی شیک چین کے ایک سربراہ جن کو ماؤزے تنگ کے مقابلے میں امریکا کی حمایت حاصل تھی اور جنھوں نے تائیوان میں حکومت قائم کی۔

# چاند کا سفر

اَپولوَ گیارہ زمین سے منزلِ قمر کو ہوا روانہ
بشر کی تاریخ نے کیا ہے شروع اپنا نیا زمانہ
برائے تسخیرِ کائنات اب بنایا جانے لگا ٹھکانہ
کہ چاند کی سطح پر اُتر کر بنائیں انسان آشیانہ
سُنیں گے کل یہ قمر کے سینے پر آج انساں اتر رہا ہے
''جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے''

اَپولو گیارہ زمیں کے چکر لگا کے جب چاند کو سِدھارا
طواف کرتا ہے اب قمر کا اور اپنی طاقت کا ہے سہارا
وہ چاند جس پر شہابِ ثاقب ہیں اور سینہ ہے سنگِ خارا
اِسی کے سینے پہ دیکھ لینا قمر کی گاڑی کو بھی اُتارا
''زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا''
''سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا''

زمین کی طرح چاند میں بھی سُنا ہے اپنی ضیا نہیں ہے
زمیں پہ ہم جس میں سانس لیتے ہیں چاند پر وہ ہوا نہیں ہے
یہی سبب ہے کہ زندگی کی وہاں پہ نشوونما نہیں ہے
مگر جراثیم کا ہے خطرہ وہاں اگرچہ وبا نہیں ہے
وہاں سے لوٹیں گے جب تو دامن پہ چاند کا بھی غبار ہوگا
مگر کوئی چاند سے بھی پوچھے کہ اُس کا کیا حالِ زار ہوگا

وہ سوچتا ہوگا میرے سر پر زمین سے کیا قضا یہ آئی
کہ میرے سینے پہ پاؤں رکھتے ہی میری ہونے لگی کھدائی
میں دُور سے دیکھتا رہا ہوں زمیں پہ انساں کی ناخدائی
شہابِ ثاقب بہت سے آئے نہ کی کسی نے یہ کج ادائی
کوئی لڑائی نہیں ہے پھر بھی یہ مجھ پہ راکٹ چلا رہا ہے
ہوائے شمسی ہے تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے

یہاں بھی انسان آگیا ہے مٹائے گا امن اوراماں کو
یہ زہرہ و مشتری کو چھیڑے گا اور ستائے گا کہکشاں کو
کمند پھینکے گا یہ زُحل پر سکوں ملے گا نہ اِس جہاں کو
"میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو"
"شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مِرا شعلہ بار ہوگا"
اسی لیے ہم سمجھ رہے ہیں قمر کے دل میں غُبار ہوگا

اِسی لیے فرض کرلیا ہے کہ چاند سے واپس آنے والے
وبا وہ لائیں گے ساتھ اپنے ہر ایک ذی روح کو جو کھا لے
قرانطینے میں اِن کو رکھو، اگرچہ وہ سب ہیں دیکھے بھالے
ہمارا کیا ہے اگرچہ اس میں خود اِن کے بھی جان کے ہیں لالے

ہے یہ بھی سچ جو فضا زمیں پر ہے چاند پر وہ فضا نہیں ہے
مگر بتاؤ زمین والو کہاں بشر کو قضا نہیں ہے

جو لوگ تحقیق کی منازل میں جان جوکھوں میں ڈالتے ہیں
وہی تو ہیں، گردشِ زمانہ کو اپنی مرضی پہ ڈھالتے ہیں
وہی ہیں جو زندگی کی دلچسپیوں کے رستے نکالتے ہیں
یہی ہے جرم اُن کا فی الحقیقت نئے جراثیم پالتے ہیں

اُنہی کو محفل سے رکھو باہر سبب سے جس کے ہے رنگِ محفل
یہاں کہاں ہم نفس ملیں گے جہاں میں تنہا ہے مردِ عاقل

یہ حکم ہے تم وہاں جو پہنچو تو پہلے اپنے عَلَم کو گاڑو
قمر کے سینے سے خاک اُڑاؤ ملیں جو پتھر اُنہیں اُکھاڑو
اتارو تصویر کیمرے سے نظر سے ماحول کو بھی تاڑو
مگر زمیں کی طرف جو لوٹو تو پہلے جوتوں کی خاک جھاڑو

مبادا خاکِ رُخِ قمر سے فضائے ارضی میں آگ نکلے
جو ذرّہ سونے سے بڑھ کے مہنگا ہے چاند کو پھر نہ بھاگ نکلے

# خلا میں بندر

ایک ''بونو''[1] نام کا بندر گیا سوئے خلا
آدمی کا کام ہے بندر کا پھنستا ہے گلا
یہ توقع بندروں سے کر بھلا ہوگا بھلا
ہے یہی بندر کے سر گویا طویلے کی بلا

ڈارون نے سچ کہا تھا اس کا یہ احسان ہے
آدمی کا پیش رو یہ بے زباں حیوان ہے

گردشِ دوراں میں آیا ہے یہ کیسا انقلاب
دیکھتے ہیں اب خلا میں بیٹھ کر بندر بھی خواب
خواب کیا ہوگا یہی ہوگا کہ ہم ہیں لاجواب
اِس بنا پہ آدمی کا بھی لگائیں گے حساب

کیا خلا میں اِس پہ گذری ہوگی اے ساقی نہ پوچھ
''کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ''

یہ تو سائنٹسٹ ہی جانیں اُنہی کو ہے خبر
اِس خلا کے خواب میں بندر کو کیا آیا نظر
اُس کو کیا معلوم اُس کا ہے خلا میں کیوں سفر
یہ سمجھتا ہوگا میں بیٹھا ہوں اونچی ڈال پر

سوچتا ہوگا کہ ہر خوردو کلاں چکّر میں ہے
یہ زمیں چکّر میں ہے یہ آسماں چکّر میں ہے

خواہ چھوٹی ذات کا بندر ہے یا ڈھبوُس[2] ہے
جس نے بھیجا ہے خلا میں اس کو وہ تو روس ہے
وہ زمیں والوں کا اِک بھیجا ہوا جاسوس ہے
ڈُگڈگی کی شکل کی اشیاء سے وہ مانوُس ہے

چونکہ آدھی ڈُگڈگی کی شکل میں ہے کیپسوُل[3]
ناچتے ہیں ڈُگڈگی کے بل پہ بندر یا اصول

دُور سے شاید زمیں کو ڈُگڈگی سمجھا ہے وہ
ناچتے رہنے کو شاید زندگی سمجھا ہے وہ
تیرتے رہنا خلا میں دل لگی سمجھا ہے وہ
آدمی خود کو ز فرطِ سادگی سمجھا ہے وہ

بات بونو کی خلا میں دیکھئے کیسے بنے
کیا ستارے شب میں آتے ہیں نظر اس کو چنے

---

(1) Bono' (2) موٹا بھدا' (3) عموماً خلاء میں خلا بازوں کو لے جانیوالے کیپسیول آدھی ڈُگڈگی کی ہیئت کے ہوتے تھے

# آدمی

جو چاند پر گیا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
جو گپ اُڑا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
جو ہنس ہنسا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
جو جی جلا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ہیں آدمی کے سارے زمانے میں رنگ روپ
ہیں آدمی ہی چاندنی اور آدمی ہی دھوپ

ہے آدمی ہزاروں کا اور ایک پائی کا
آدھا ہے اپنی ماں کا تو آدھا ہے دائی کا
پیشہ بھی آدمی نے سنبھالا گدائی کا
دعویٰ بھی آدمی نے کیا ہے خدائی کا

گورا بھی آدمی ہے تو کالا بھی آدمی
بُزدل بھی آدمی ہے جِیالا بھی آدمی

جب آدمی کے دِل کو چُراتا ہے آدمی
سینے سے اپنے اُس کو لگاتا ہے آدمی
اور اِس طرح سے عُمر بڑھاتا ہے آدمی
مشکل سے اِس جہان سے جاتا ہے آدمی

جاتا کہاں ہے خود وہ پکڑوایا جاتا ہے
یعنی فرشتہ بھیج کے بُلوایا جاتا ہے

ڈالا ہے آدمی نے ہر اِک آدمی پہ جال
"ہے آدمی بجائے خود اِک محشرِ خیال"
نِکلا تمام عُمر کی کوشش کا یہ مآل
آیا تھا روتا پیٹتا جاتا ہے خستہ حال

اِس پر یہ حال ہے کہ اکڑتا ہے آدمی
غیروں سے اور اپنوں سے لڑتا ہے آدمی

یہ آدمی لڑائی کو ویت نام میں گیا
وہ کوریا گیا کبھی آسام میں گیا
وہ تل ابیب و قاہرہ و شام میں گیا
یہ آدمی ہی متّحداقوام میں گیا

پھر آدمی کو امن سِکھاتا ہے آدمی
بھینسوں کے آگے بین بجاتا ہے آدمی

ابلیس کو فریب سکھاتا رہا ہے وہ
اور شعبدے ہزار دکھاتا رہا ہے وہ
عالَم کو اُنگلیوں پہ نچاتا رہا ہے وہ
ہم کو جزا سزا سے ڈراتا رہا ہے وہ

دوزخ سے وعظ کہہ کے بچاتا ہے آدمی
پر خود کبھی کبھی وہیں جاتا ہے آدمی

ہے آدمی جو کرتا ہے سب سینہ زوریاں
کرتا ہے لُوٹنے کے لیے نفع خوریاں
بھرتا ہے اِس بہانے سے اپنی تجوریاں
دشمن کو بیچ کھاتا ہے گندم کی بوریاں

چیزوں کی قیمتوں کو بڑھاتا ہے آدمی
اور گاہکوں کو خون رُلاتا ہے آدمی

---

# چڑیا گھر[1]

چڑیا گھر میں جلسۂ جمعیتِ اقوام ہے
بحث اِس پر ہورہی ہے کِس پہ کیا الزام ہے
سنتے ہیں بندر شرارت کے لیے بدنام ہے
جو نگہباں ہے اُسی کا رزق دینا کام ہے

شاخ پر بیٹھی ہیں چڑیاں نیچے ہاتھی ہے کھڑا
کہتی ہیں چڑیاں کہ ہاتھی ہوگیا ہے کیوں بڑا

بولے وہ بندر جنہیں ایجنٹ کہتے ہیں عوام
بندروں کو چاہیے اِس گھر میں جمہوری نظام
ہے غذا مقدار میں کم ، کیسے کھائیں گے تمام
بانٹ دیں سب کو برابر بندروں کا ہے یہ کام

خیریت پیشِ نظر ہے چونکہ بندر بانٹ میں
بندروں کی اب گذر ہوتی ہے کاٹ اور چھانٹ میں

کہتی ہیں چڑیاں کہ دانہ چُنوایا گیا
ایک ہی لقمہ بنا کر اس کو ہاتھی کھا گیا
ایک مچھر کان میں ہاتھی کے بِٹھلایا گیا
احتجاج اِس شکل میں ہاتھی کو سُنوایا گیا

ہاتھیوں کی نسل کی منصوبہ بندی چاہیے
ہم کو نصب العین کے اندر بلندی چاہیے

چڑیا گھر میں آج کل بائیس(2) ہاتھی ہیں مقیم
اور چڑیوں کا یہاں حقِّ سکونت ہے قدیم
اور انہی چڑیوں کی حالت بھوک نے کردی سقیم
صرف بندر ہی یہاں تھے صاحبِ عقلِ سلیم

اُن کو رحم آیا بہت چڑیوں کے پتلے حال پر
کردیا کہہ سن کے آمادہ انہیں ہڑتال پر

چونکہ بندر چاہتے تھے خوب جنگ اُن میں ٹھنے
صلح چاہیں بھی تو اِس کی بھی نہ کچھ صورت بنے
اِس طرح روٹھیں، نہ چڑیا ہی نہ ہاتھی ہی منے
تاکہ مل جائیں اُنہیں بھی اِس لڑائی میں چنے

بولے یہ بندر کہ یہ بائیس ہاتھی ہیں سفید
تنگ آ کر ان سے پبلک ہوچکی ہے ناامید

بولے ہاتھی کام کرتے ہیں بڑے، گُر ہیں بڑے
ہم اُٹھاتے ہیں اُسے جو بوجھ بھاری آ پڑے
چڑیا گھر کی صنعتوں میں مرحلے تھے جو کڑے
ہم نے ان کو سَر کیا تب تھے کہاں چڑیاں چڑے

فرض کر لیجے کہ چڑیا گھر میں سب آزاد ہوں
غیر ممکن ہے کہ سارے اک جگہ آباد ہوں

گرچہ چڑیوں کو حقِ خود اِختیاری چاہیے
لیکن اس گھر کو بھی کچھ خدمت ہماری چاہیے
چڑیا گھر میں صنعت اور کچھ دستکاری چاہیے
ہم کو ہڑتالوں کے دُکھ سے رستگاری چاہیے

بندروں کی کیا ہے ہر جا کودتے پھرتے ہیں وہ
جِس جگہ گُڑ اور چنے دیکھیں وہیں گِرتے ہیں وہ

چڑیا گھر کا آ گیا مالک سنا اُس نے جو شور
بندروں کو ایک پنجرے میں پکڑ لایا بزور
مور چِلاّنے لگے اپنی زباں میں چور چور
بولا یہ اُلّو کہ ہے چشمِ بصیرت ان کی کور

چاہتے ہیں ہم کو ویرانے میں آزادی ملے
زندگی جنگل کی ہم کو سیدھی اور سادی ملے

بولا مالک ایسی آزادی ہے اِک سودائے خام
تُم پہ لازم ہے کرو اِک دوسرے کا احترام
اپنی اپنی حد کے اندر رہ کے چل سکتا ہے کام
مت بچھاؤ واسطے چڑیوں کے دانہ اور دام
مِل کے وہ رہتے ہیں جن کا آدمیت کام ہے
جانور لڑتے ہیں انساں مُفت میں بدنام ہے

---

(1) مرادپاکستان (2) پاکستان کے امیر ترین 22 خاندان جن کے پاس ملک کی بیشتر دولت تھی

# سنٹرل اِنفارمیشن سروس

نویدِ زندگی اُنیس سو چونسٹھ نے سُنوائی
کہ سروس بن گئی، اِنفارمیشن میں بہار آئی
جنابِ صدرِ پاکستان نے کی یہ مسیحائی
بصد الطاف گوہر[1] دے کے بہرِ عزّت افزائی
مُجھے سی آئی ایس بنوا دیا اور وہ بھی سرکاری
بہت نازاں ہیں اس اعزاز پر یارانِ اخباری

زباں ہوں میں حکومت کی وسیلہ ہوں سماعت کا
بھرم رکھوں گا میں اس ملک کے اندر صحافت کا
روایت کا درایت کا دِیانت کا ثَقافت کا
ہر اک اس شے کا جو معیار ہوتی ہے شرافت کا
صحافی بھی نظر آنے لگیں گے اَب تو سروِس میں
سنا ہے بیس فیصد آئیں گے باہر سے لوگ اِس میں

میں ہوں اِک خاندانی فرد اور اعلیٰ نسب والا
یقیں محکم، عمل پیہم، ہے طرزِ زندگی اعلیٰ
محبت ہے وطن سے مجھ کو میں ہوں اس کا متوالا
بناؤں گا قلم سے گِرد اِس کے نور کا ہالہ

جہادِ زندگانی میں لکھوں گا اِس طرح کالم
"یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم"

یہاں ہر گام پر اہلِ وطن کی آزمائش ہے
وہ دیکھو سی این او[2] جس میں سُخن کی آزمائش ہے
وہ ڈی ایف پی[3] ہے جس میں قلم و فن کی آزمائش ہے
پریس اِنفارمیشن جان و تن کی آزمائش ہے

خدا آباد رکھے شاد رکھے ہم نواؤں کو
مئے سروِس پلا دی ہم نے آخر پارساؤں کو

---

(1) الطاف گوہر، سیکرٹری اطلاعات و نشریات، (2) Central News Organization C.N.O،
(3) Department of Film Production D.F.P

# تیل کی دھار

جب ۱۹۵۰ء کی دہائی کے وسط میں ایران کے وزیر اعظم مصدق نے ایران کے تیل کو نیشنلائز کیا تھا یہ نظم اس وقت لکھی گئی تھی۔ حکومت برطانیہ اور حکومت امریکا اس پالیسی کے سخت مخالف تھے۔

اینگلو اِیرانین[1] آئل کی دیکھو ریل پیل
کیا عجب گر پالیسی[2] انگریز کی ہوجائے فیل[3]
فارسی پڑھتا نہیں اور بیچتا پھرتا ہے تیل
اک طرف ہے واڈ کا[4] اور اک طرف ہے کوک ٹیل[5]

اور اِدھر سے حافظ و خیّام کے خُم کی شراب
کہہ رہی ہے ''آفتاب آمد دلیلِ آفتاب''

رنگ لے آئی ہے مسلم دشمنی کی پالیسی[6]
جان بُل[7] کی جان ہے اِس وقت دلدل میں پھنسی
انتہائی اضطراب اور انتہائی بے بسی
آرہی ہے مشرق وسطیٰ[8] کے ملکوں کو ہنسی

''اے کہ می گوئی بہ ایراں آشنائی مشکل است''
''آشنائی می تواں کردن، جُدائی مشکل است''

میکدے سے ہیگ[9] کے انصاف کی نیلم پری
دے رہی ہے فیصلہ ازراہِ عاجز پروری
رہزنِ مغرب کو جائز ہے ہر اِک غارت گَری
وائے ناکامی کہ پھر بھی چِھن گئی ریفائنری[10]

کیا خبر تھی اِنقلابِ آسماں ہوجائے گا
''تیل'' کا مِلنا نصیب دُشمناں ہوجائے گا

یہ مصدّق[11] فیصلہ ہے کاتبِ تقدیر کا
تیل کا لانا نہیں ''لانا ہے جُوئے شِیر کا''
یو این او میں وقت آنے دیجئے تقریر کا
کاٹ کیا لائیں گے غش کی برمحل تدبیر کا

جان بُل[12] کا سامری یعنی کہ انکل سام[13] آج
خطّۂ ایران کو دیتا ہے ڈالر کا خراج

---

(1) Anglo Iranian oil، (2) policy، (3) Fail، (4) Vodka ایک قسم کی روسی شراب، (5) Cocktail (6) Policy، (7) John Bull، (8) Middle East، (9) Hague (بین الاقوامی عدالت کا مقام)، (10) Refinery، (11) مصدق ایران کے وزیر اعظم، (12) ''جان بُل'' اور ''انکل سام'' برطانیہ اور امریکا کے استعاراتی نام ہیں۔

# ذیابیطس کے مریض

یہ نظم ذیابیطس کلب کے سالانہ اجلاس میں ۱۹/ اگست ۱۹۷۳ء کو پڑھی گئی

وہ مریضانِ ذیابیطس جو آئے ہیں یہاں
اُن میں بچّے بھی ہیں شامل اور بوڑھے اور جواں
اِس زمانے میں کہ جب ہے ملک میں ہر شے گراں
یہ بناتے ہیں شکر، بڑھتی ہیں جس سے تلخیاں

خون کی نلیوں میں کالسٹرول بڑھ جائے اگر
''پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر''

خون میں اِن کے شکر ہے، شُکر کرتے ہیں مگر
یہ دعا دیتے ہیں 'اِنسولین' کو شام و سحر
'کاربوہائیڈریٹ[1]' آجاتے ہیں جس شے میں نظر
کھانے پینے میں کِیا کرتے ہیں یہ اُس سے حذر

یہ جو میٹھے خون والے ہیں انہیں معلوم ہے
''پنکریاٹک[2] جوس'' میں سے ان کے کچھ معدوم ہے

یہ نمک خوارانِ مِلّت جب کہیں پیتے ہیں چائے
''آ گہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے''
ڈالتے ہیں یہ ''سویٹکس[3]'' اس میں چینی کی بجائے
جس کو اپنی جان پیاری ہو شکر کس طرح کھائے

یہ ہیں وہ فرہاد جو شیریں سے اپنی دُور ہیں
ہے ذیابیطس وہ بُڑھیا جس سے یہ مجبور ہیں

یہ جو بچّے ہیں ذیابیطس کے غم میں مبتلا
یاالٰہی اِن کی گاڑی عمر کی ایسے چلا
اِن کے قابو آ کے دب جائے مرض کی یہ بلا
بچ رہے گا احتیاطوں میں اگر رہ کر پلا

شرط یہ ہے زندگی میں نظم ہو اور اِنضباط
احتیاط اور احتیاط اور احتیاط اور احتیاط

ہو ذیابیطس جسے اُس کی دَوا پرہیز ہے
ہے رفیقِ زندگی یہ دکھ جو درد آمیز ہے
اِس کا پھر ورثے میں ملنا بھی تعجب خیز ہے
خاندانی قسم کا دُکھ ہے حذر انگیز ہے

ورنہ میٹھا خوں اگر رگ میں رواں ہوجائے گا
''دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہوجائے گا''

---

(1) ''کاربوہائیڈریٹ'' یعنی نشاستہ: وہ غذائی اجزا (علاوہ شکر اور شیرین اشیاء کے) جو خون میں شکر کا اضافہ کرتے ہیں؛ (2) ''پنکریاٹک جوس'' انسانی لبلبہ کا وہ عرق جو اِنسولین پیدا کر کے خون میں شکر کو مناسب حدود میں رکھتا ہے؛ (3) مصنوعی اور کیمیاوی گولیاں جو شکر کا نعم البدل ہیں مٹھاس کے طور پہ استعمال کی جاتی ہیں۔

## ادارۂ یادگارِ غالب کی پنسل[1]

یہ پِنسل، یہ لوح اور قَلم ایک قالِب
اَدا اِس سے ہوتے ہیں لاکھوں مطالِب
کہ آئیں جو علم اور فن کے ہیں طالِب
"بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالب"
"تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں"
ہے کِتنا کسے ذوق ہم دیکھتے ہیں
جو لوح و قلم کا نَسب دیکھتے ہیں
اِنھی میں تجلّیِ رب دیکھتے ہیں
عجم دیکھتے ہیں، عرب دیکھتے ہیں
جو رکھتے ہیں ذوقِ ادب دیکھتے ہیں
قلم کا جو "نقشِ قدم دیکھتے ہیں"
"خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں"

یہ پنسل جو نِکلی ہے دُلہن سی بن کے
ہیں سُرخ اور سَبز اِس میں پرتو چمن کے
اپتے دے رہی ہے بہشتِ عدن کے
''دِلِ آشُفتگاں خالِ کُنجِ دَہَن کے''

''سوَیدا میں سیرِ عدَم دیکھتے ہیں''
کہ دنیا میں جنّت کو ہم دیکھتے ہیں

اور اِس میں سیاہی مشابہ ہے تِل سے
جو رخسارِ جاناں سے ہیں مُتصّل سے
اُٹھا لطف اِسی نعمتِ مُستقل سے
''سراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے''

''کہ شب رَو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں''
قلَمرو میں دیر و حرم دیکھتے ہیں

اگر ہو سکے تم بھی برسی منا لو
قلم باغِ جنّت سے لا کر لگا لو
اور اُس میں نئے تازہ غنچے نکالو
مضامیں سے بزمِ خیالی سجا لو

یہ پنسل جو ہے سامنے مختصر سی
مناتی ہے غالب کی صد سالہ برسی

بنائی گئی پنسل اک یادگاری
جگا دی ہے جس نے چھٹی حِس ہماری
کہ غالِب کی جنّت سے آئی سواری
''تماشا کر اے محوِ آئینہ داری''
''تجھے کس تمنّا سے ہم دیکھتے ہیں''
تجھے ماورائے عدَم دیکھتے ہیں

قلم مرزا نوشہ کا اور اُس کا دَم خم
یہ کہتا ہے اِس کے لیے سارا عالم
تُو ہے زندہ کرنے کا پیغامِ پیہم
''تِرے سروِ قامت سے اِک قدِّ آدم''
''قیامت کے فِتنے کو کم دیکھتے ہیں''
تجھی میں ادب کا بھرم دیکھتے ہیں

---

(1) غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر ادارۂ یادگارِ غالب نے رکن سازی کے لیے پنسلیں تقسیم کی تھیں

# سُرخ اور سبز پتّے

(بنگلہ دیش کے قیام کے بعد سو اور پانچ سو کے نوٹ منسوخ کر دیئے گئے تھے)

جنازہ گاہِ بینک میں ہے لاش سو کے نوٹ کی
ضرورت اب نہیں رہی کِسی طرح کی اوٹ کی
نہ بٹوے کی، نہ جیب کی، نہ تھیلی اور نہ پوٹ کی
نہ اِس میں کوئی بحث ہے کھرے کی اور نہ کھوٹ کی

جو نوٹ دے رہا ہے اُس کا گر نہ اِس میں ہرج ہو
اور اُس کا کوئی باپ ہے تو ولدیت بھی درج ہو

نہیں جو حضرتِ مسیح، نام لِکھیں باپ کا
بغیر باپ کے ہوئے، یہ معجزہ تھا آپ کا
نہ اُن کے پاس نوٹ تھا وہ بنگلہ دیش چھاپ کا
خیال بھی نہ تھا کبھی بغاوت اور پاپ کا

جو پانچ سو کا نوٹ دینے بینک میں اب آئے گا
وہ بھاگ جائے بعدازاں تو باپ پکڑا جائے گا

وہ بوڑھی بوڑھی عورتیں چھپائے تھیں جو نوٹ کو
اُدھیڑتی ہیں بیٹھ کر رضائیوں کی گوٹ کو
وہ کوستی ہیں کالعدم عوامی لیگ بوٹ[1] کو
نشانِ شش نکات[2] کو اور اُن کے حق میں ووٹ کو

جو سُرخ سُرخ پتے ہیں سب اُن سے خوف کھاتے ہیں
وہ کوڑیوں کے مول بھی نہیں ہیں جب بھناتے ہیں

ادائیگی سے ٹیکس کی بچا تھا حِیلہ ساز جو
وہ کوئی نفع خور یا کوئی ذخیرہ باز ہو
تو سرخ و سبز نوٹوں نے بتایا اُس کے راز کو
نہ کام آسکے گی اب جو پیر کی نیاز دو

تمام حسرتوں کا خون، اشک بن کے بہہ گیا
جو سرخ پتہ ہاتھ میں تھا وہ دھرا ہی رہ گیا

ریاستیں یہاں نہیں، کہاں اُسے بُھنائیں ہم
جو مُہر بنگلہ دیش کی ہو کِس طرح چھپائیں ہم
جو ہم کو دے کے چل دیا کہاں سے اُس کو لائیں ہم
نہیں تو پانچ سو بھی جائیں، خود کو بھی پھنسائیں ہم

چھچھوندریں ہیں سانپ کے دہن میں جتنے نوٹ ہیں
اُگل نِگل نہیں سکیں، یہ زہر کی سی پوٹ ہیں

---

(1) بنگلہ دیش کے قیام میں پیش پیش جماعت عوامی لیگ کا انتخابی نشان Boat یعنی کشتی تھا۔
(2) عوامی لیگ نے چھ نکاتی منشور جاری کیا تھا جس سے اُس وقت کے موبی پاکستان کے لیڈروں کو اختلاف تھا۔

# بیٹی کا جہیز

ایک لڑکی کا مجھے تیاّر کرنا ہے جہیز
ہو رہی ہے عقل اور جذبات میں میرے ستیز
اَچھا خاصا آدمی تھا بن گیا نہرِ[1] سویز
بسترِ راحت نہیں ہے آپریشن کی ہے میز
کشمکش میں مبتلا ہوں چونکہ ہوں لڑکی کا باپ
یہ وہ منزل ہے کہ گزریں گے وہاں سے میں اور آپ
سوچتا ہوں قرض لے کر اِس کی تیاری کروں
اور مُہیاّ عمر بھر کے واسطے خواری کروں
قرض خواہوں سے بچوں پھر اُن سے عیاّری کروں
مُنہ چُھپاؤں، گھر جب آئیں عُذرِ بیماری کروں
یہ خَبر پہنچے گی اِس بیٹی کی بھی سسرال میں
اِس کے ابّا قرض لے کر پھنس گئے جنجال میں

قرض پر جو سود ہے دکھلائے گا رعنائیاں
وہ بھی پھر نامِ خدا ہو جائے گا اِتنا جواں
سخت پچھتائیں گے یاد آئے گی جب یہ داستاں
''قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں

''رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دِن''
مِل ہی جائے گا ہمیں وارنٹِ دَستی ایک دِن

سوچتا ہوں پھر کہ ساری زندگی ہے مُستعار
یہ زمانے کی روش ہے میں بھی لُوں سُودی اُدھار
ورنہ لڑکی میرے گھر سے جا کے ہوگی شرمسار
کیا جہیز آیا ہے ساتھ اُس سے کہیں گے باربار

اے مری نورِ نظر، لختِ جگر، جانِ پدر
دُوں گا میں تُجھ کو جہیز اب جان پر بھی کھیل کر

ورنہ میری ناک جو چھوٹی سی ہے کٹ جائے گی
کنبہ والوں میں مری عزّت بہت گھٹ جائے گی
نُقلِ محفل کی طرح سے یہ خبر بٹ جائے گی
جِس کو گھر گھر ایک بُڑھیا لے کے سرپٹ جائے گی

کیا زمانہ آگا بچّی کا ہے کیسا جہیز
صِرف قرآن اور چکّی! دی نہ کرسی اور نہ میز

ریڈیو ہے نہ گراموفون ہے نہ کار ہے
نہ کوئی بھاری سا زیور نہ جڑاؤ ہار ہے
بیاہ کیوں کرتے ہیں جلد ان پر یہ بیٹی بار ہے؟
اپنی نظروں میں جہیز ایسا بہت بیکار ہے
لڑکے والے بامُروّت ہیں تو کُچھ کہتے نہیں
ہم جو سچّی بات ہے وہ بن کہے رہتے نہیں
بعدازاں سرگوشیاں کرتے رہیں گے رشتہ دار
اپنے ساتھ اِس نے لیا ہم سب کی عزّت کو اُتار
جب برات آئی تو کھانا دے سکا نہ اِن کو یار
کہتا ہے قانون کا پابند ہے بے اختیار
دِل اگر چاہے تو ہر صورت بنا لیتے ہیں کام
اپنے مطلب کے لیے قانون کا یہ احترام
باجے گاجے کی نہ ہوگی چونکہ اِس شادی میں دُھوم
مجھ پہ یہ الزام رکھیں گے کہ میں ہوں مردِ شُوم (کنجوس)
عقل سمجھاتی ہے مجھ کو جب کہ میں جاتا ہوں گھوم
"ہم مُوحدّ ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم"
لیکن اِک حوّا کی بیٹی ہے جو میری اہلیہ
کہتی ہے میری سنو اب تم نے سب کچھ کرلیا

صِرف خالی شاعری سے چل نہیں سکتا ہے کام
بَعد مُدّت کے پھنسا ہے مرغِ وحشی زیرِ دام
اُس کی بیٹی جائے یوں اِتنا بڑا ہو جس کا نام
جیب کاٹو نقد لاؤ بس کہیں سے لاؤ دام

مجھ کو یہ ڈر ہے کہ بہکائے میں آ جاؤں گا میں
لیلیٰء محمل نشیں کو کیسے سمجھاؤں گا میں

---

(1) نہرِ سوئز (Suaz Canal) کو انیس سو پچاس کی دہائی میں مصر نے قومیا لیا۔ اس پر برطانیہ اور فرانس نے مصر پہ حملہ کر دیا اور امنِ عالم خطرے میں پڑ گیا تھا۔

## کاغذ

اِس جہاں میں آج کل کاغذ کا سِکّہ ہے رواں
اور مُنشی جی تو کھاتے ہیں اِسی کی روٹیاں
ہِل نہیں سکتے ہیں وہ کاغذ ہو جن کے درمیاں
دوڑتے پھرتے ہیں کاغذ کارواں در کارواں

گر نہ ہو کاغذ ثبوتِ دل لگی لائیں گے کیا
''ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے 'کیا'

منحصر کاغذ پہ ہے دنیا کی ہر صُلح و صَلاح
دل کے منصوبوں کا ہم کرتے ہیں ایسے افتتاح
ڈھونڈتے ہیں کاغذی تحریر کے اندر فلاح
دستخط جب تک نہ ہوں کاغذ پہ کیسے ہو نکاح

جب کہیں شادی ہوئی شادی کا اِک دفتر کُھلا
''رکھیو یارب! یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا''

میرے اُن کے درمیاں کاغذ ہی فریادی سہی
وہ ستمگر بھول جانے پر مجھے راضی سہی
یہ بھی اُس کی دلبری کی ایک غمّازی سہی
بَل پہ کاغذ کے ملاقاتیں ہوں گو آدھی سہی

مجھ کو دکھلاتا ہے کاغذ ہی خطِ رخسارِ دوست
"سرکرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست"

کاغذی تھا پیرہن یوسف کا یہ دیکھا نکھار
بیشتر علم و ہنر ہیں دوشِ کاغذ پر سوار
ہے یہ کاغذ کے خزاں نادیدہ پھولوں کی بہار
کون کہتا ہے کہ ہے یہ فصلِ گُل نا پائیدار

مصر کی ممیوں پہ کاغذ کا لِپٹتا تھا کفن
آج تک تازہ ہے اُن کا قِصّہٴ دورِ کہن

چل رہے تھے آج تک کاغذ پہ پیغام و سلام
کام کاغذ سے یہی لیتے تھے اب تک خاص و عام
لیکن اب تو ہو رہا ہے اِک نیا ہی انتظام
یعنی کپڑے کی جگہ کاغذ سے اب لیتے ہیں کام

کاغذی بادام گویا آج کل انسان ہے
اب گریباں چاک کرلینا بہت آسان ہے

اب بحمداللہ کاغذ سے بناتے ہیں لباس
اِس تصوّر سے بُجھا لیتا ہوں اپنے دل کی پیاس
اِک بتِ سیمیں بدن کے حُسن کا ہو انعکاس
اور میرا نامۂ اعمال بھی ہو آس پاس

ثبت ہوگا نامۂ اعمال میں اُس کا جمال
''ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال''

یہ مُیسّر ہو تو انساں ایک اسکالر بنے
نامۂ دلدار سے نکٹائی اور کالر بنے
میرا خط اُس کے گریباں کے لیے جھالر بنے
کاش اُن کی آستینوں سے مِرا مَفلر بنے

اِس طرح میں صاحبِ خیر و خبر ہوجاؤں گا
نامۂ حسنِ بتاں کا بُک کور[1] ہوجاؤں گا

پہلے اِس دنیا میں سُوتوں کی سلائی بڑھ گئی
پھر نئے سُوتوں کی قیمت سے دُھلائی بڑھ گئی
اِس طرح کاغذ کے اندر روشنائی بڑھ گئی
تن حسینوں کا ڈھکا رنگیں ادائی بڑھ گئی

جب سے کاغذ نے جگہ کپڑے کی لی پوشاک میں
شمع ہے فانوس میں پروانہ اُس کی تاک میں

کاغذی پوشاک بنوانے کا جب فیشن بنے
نامۂ احوالِ دل سے یار کا دامن بنے
ہر وَرَق غزلوں کا اُس یوسف کا پیراہن بنے
ہو بہت باریک کاغذ جس سے ہر چِلمن بنے

وہ مجھے دیکھا کرے اور میں اُسے دیکھا کروں
''اے غم دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں''

کاغذی پوشاک سے آئیں گے بے شک انقلاب
پڑ گئی جب بھی نظر پلٹے گی ہوکر کامیاب
ہو لفافہ جس کا پھولا اس کو سمجھیں گے ثواب
حُسن کی دنیا میں آئے گا نظر یہ انتخاب

''کاغذی ہے پیرہن ہر پَیکرِ تصویر کا''
''سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا''

---

# امتحان

امتحاں سر پر ہے لڑکے لڑکیاں ہیں اور کتاب
ڈیٹ شیٹ[1] آئی تو گویا آ گیا یومُ الحِساب
صرف اک کاغذ کے پرزے سے ہوا یہ انقلاب
خود بہ خود ہر اک شرارت کا ہوا ہے سَدِباب
پہلے تھیں وہ شوخیاں جو آفتِ جاں ہوگئیں
"لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں"

وقت رٹنے کے لیے کم رہ گیا زیادہ ہے کام
سال بھر جن کو نہ دیکھا وہ خُلاصے نیک نام
سامنے رَکھے ہیں، اُن کو جھک کے کرتے ہیں سلام
اِن کی پُوجا ہی میں سارا وقت ہوتا ہے تمام
ٹیلیویژن بھی نہیں غائب ہوئے ہیں سارے کھیل
ڈال کر کُولھو میں بچّوں کو نکالو اُن کا تیل

آج کل بُھولے ہُوئے ہیں سب الکشن اور ڈی بیٹ[2]
پریکٹیکل کی کاپیوں کے آج کل بھرتے ہیں پیٹ
حاضری اب کون بولے، کون اب آئے گا لیٹ
کالج اور اسکول ہیں سنسان خالی اُن کے گیٹ

بند ہے کمرے کے اندر گردشِ لیل و نہار
کیا خبر، آئی خزاں کب، کب گئی فصلِ بہار

امتحاں کا بھوت ہے یا ہے قیامت کا سماں
امّی اور ابّا سے چھپ کر رو رہی ہیں لڑکیاں
کہتے ہیں لڑکے کِیا کرتے تھے جو اٹکھیلیاں
''یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں''

اب ہرن کی طرح سے بھولے ہوئے ہیں چوکڑی
اِس قدر رٹنا پڑا ہے جل اُٹھی ہے کھوپڑی

حال پر بچّوں کے ہیں بے حد پریشاں والدین
ساتھ میں اولاد کے اُن کا اڑا جاتا ہے چین
گرچہ ہے تعلیم اور رَٹنے میں بُعدالمُشرقین
سوچتے ہیں وہ کہ اچھّا ذہن ہے خالق کی دَین

کیا خبر تھی اِس طرح جی کا زیاں ہوجائے گا
''یعنی یہ پہلے ہی نذرِ اِمتحاں ہوجائے گا''

رات بھر جاگیں گے وہ جو سال بھر سوتے رہے
کاٹنے جاتے ہیں گندم گرچہ جَو بوتے رہے
کیا توقع اُن سے رَکھیں فیل جو ہوتے رہے
نقل کر کے داغ کو دامن سے جو دھوتے رہے

نقش فریادی ہے اِن کی شوخیٔ تحریر کا
معرکہ ہوتا ہے اب تدبیر کا تقدیر کا

جو سوال امپارٹینٹ[3] آتا ہے ہر اِک باب میں
غور سے دیکھا ہے اُس کو دن دہاڑے خواب میں
ہوگیا ہوں اِس لیے بدنام میں اصحاب میں
آؤٹ کر ڈالا ہے پیپر عالم اَسباب میں

کچھ تو ہے آخر جو گیس پیپر میں آیا یاد تھا
جِس نے پیپر سیٹ کیا ہے وہ مرا اُستاد تھا

---

(1) Date Sheet، امتحان کے Subjects کی تاریخیں، (2) Debate، (3) Important

# یکم مئی

یہ مئی کی پہلی، دن ہے بندۂ مزدور کا
مدتوں کے بعد دیکھا اِس نے جلوہ حُور کا
یہ جو رشتہ دار تھا ہم سب کا لیکن دُور کا
مِل کے مالِک نے اِسے رُتبہ دیا منصور کا

جب لگایا حق کا نعرہ دار پر کھینچا گیا
نخلِ صَنعَت اِس کے خوں کی دھار پر سِینچا گیا

آج لیبر یونین میں شادمانی آئی ہے
آج مزدوروں کو یاد اپنی جوانی آئی ہے
مِل کے مالک کو مگر یاد اپنی نانی آئی ہے
یاالٰہی کیا بلائے آسمانی آئی ہے

سُنتے ہیں مزدور سے مالک کا مُہرہ پِٹ گیا
"ایک جا حرفِ وفا لِکھّا تھا وہ بھی مِٹ گیا"

ہوتا ہے 'مے ڈے'[1] کا اور 'مے پول'[2] کا جب انتظام
ناچتے ہیں بانس کے گِرد آ کے یوروپی عوام
لیکن اَب ناچے گا وہ ظالمِ کہ جو ہے بَد لگام
بانس کے بل پر دکھائے جیسے بندر اپنا کام

وہ جو پہلے تھا کبھی بندر، مداری بن گیا
یعنی مزدور، افسرِ سرمایہ کاری بن گیا

بعض ایسے تھے جو سرمائے کے ٹھیکیدار تھے
کہتے تھے مزدور کو خر اور خود خرکار تھے
چور بازاری کی جڑ تھے اور بڑے بٹ مار تھے
نفع خوری کے سوا ہر کام سے بیزار تھے

اب حلق میں اُن کے جو کھایا اٹک کر جائے گا
غیر ملکوں میں نہ سرمایہ بھٹک کر جائے گا

پوچھو اِن سرمایہ داروں سے کہ کب جاگو گے تُم
یا یونہی پیتے رہو گے بے مروّت مے کے خُم
دیکھو ہر سال آئے گی ماہِ مئی کی یہ یکم
سُنتے ہیں سیدھی نہیں ہوتی کبھی کُتّے کی دُم

تم مگر رکھتے ہو ایک انسان کی نوک اور پَلک
''بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک''

قابلِ عزّت ہیں اِس دنیا کے محنت کش عوام
مُلک کی دولت ہیں یہ، واجب ہے اِن کا احترام
اُس کے یہ ممبر ہیں لیبر یُونین ہے جس کا نام
اِن کی محنت کے دیے جائیں گے اِن کو پورے دام
یہ نہیں ہوگا، خفا ہوکر دِہاڑی کاٹ دی
آدھے رستے لائے اور انجن سے گاڑی کاٹ دی

---

(1)May Day' یوم مئی مزدوروں کا عالمی دن' (2)May Pole پھولوں سے سجا ہوا بانس جس کے گرد یورپ کے ممالک میں رقص کرتے ہیں

# میں نشے میں ہوں

ہڑتال کرنے سے نہ ٹلو میں نشے میں ہوں
اے غیرملکیوں کی گلو[1] میں نشے میں ہوں
میرا جلوس لے کے چلو میں نشے میں ہوں
پھر خاک سب کے مونہہ پہ ملو میں نشے میں ہوں
''یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں''
''اب دو تو جام خالی ہی دو میں نشے میں ہوں''

گھوڑے پہ میں سوار ہوں سُنتے ہو پیدلو
مجھ پر سوار نشہ ہے میں اُس کے ہوں جلو
جلسوں میں جب بھی جاوٗ مجھے ساتھ لے چلو
اور خالی خوُلی نعروں سے پھر مُونگ بھی دَلو
''ایک ایک فرطِ دَور میں یوں ہی مجھے بھی دو''
''جامِ شراب پُر نہ کرو میں نشے میں ہوں''

اِس قوم کی فلاح ہے جام و سُبو کے بیچ
تُم انتخاب جا کے لڑو ہا و ہو کے بیچ
دُشنام اور بَلووں کے اور دُوبدُو کے بیچ
جیسے کہ کوئی بیٹھا ہو بزمِ عدُو کے بیچ
''مستی سے درہمی ہے مری گفتگو کے بیچ''
''جو چاہو تم بھی مجھ کو کہو میں نشے میں ہوں''

میں رہنمائے قوم ہوں' یہ ہو چکا ہے طے
کھاتا رہا ہوں گالیاں ماضی میں پے بہ پے
گذری ہے عمر جیل میں لیکن یہ تا بہ کے
میرا جلوس لے کے مری قوم جب چلے
''یا ہاتھوں ہاتھ لو مجھے مانندِ جامِ مے''
''یا تھوڑی دور ساتھ چلو میں نشے میں ہوں''

مجھ پر بھی وقت آ کے پڑے ہیں یہاں کڑے
یہ وہ زمیں ہے جس پہ گِرے ہیں بڑے بڑے
تم کیوں اُکھاڑتے ہو وہ مُردے جو ہیں گڑے
دیکھے نہیں ہیں تم نے جو چکنے تھے وہ گھڑے
''معذُور ہوں جو پاؤں مِرا بے طَرح پڑے''
''تم سَرگراں تو مجھ سے نہ ہو میں نشے میں ہوں''

یہ بات عقل میں بھی سماتی نہیں ہے کچھ
شُہرت تو مفت ووٹ دلاتی نہیں ہے کچھ
ایمانداری کام بناتی نہیں ہے کچھ
لٹھ کی زبان بھی مجھے آتی نہیں ہے کچھ
بھاگی تمہاری رائے تو جاتی نہیں ہے کچھ
"چلتا ہوں میں بھی، ٹک تو رہو، میں نشے میں ہوں"

آیا ہے وقت ایسا جو پہلے نہ تھا کبھی
دشوار راستہ بھی ہے منزل ہے دور ابھی
پبلک سے جھوٹے وعدے بھی کر لیتے ہیں سبھی
میں نے بھی اختیار کی یہ پالیسی جبھی
"نازک مزاج آپ قیامت ہیں میر جی"
"جوں شیشہ میرے مونہہ نہ لگو میں نشے میں ہوں"

بدمست ہو گئے ہو الکشن میں جعفری
سر میں نشے کے ساتھ ہے سودائے رہبری
تم کس جگہ کے پنچ ہو کیا ہے برادری
کیوں ڈھونڈتے ہو ملک میں جو ووٹ ہو فری
تم ہوش میں نہیں ہو تو ہے بات دوسری
یہ کہہ کے گھر میں بیٹھ رہو میں نشے میں ہوں

---

(1) "گُل" یعنی مشین۔ "گُلو" مشینوں

# ہارا ہوا لیڈر اور اس کی فریاد

سادگی سے خود کو بھولو[1] پہلواں سمجھا تھا میں
''آب و گِل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں''
ہو سیاست کا بُرا ، چیلنج بھولو کو کیا
اُس قوی ہیکل کو مُورِ ناتواں سمجھا تھا میں
وہ اُٹھا کر مجھ کو ہاتھوں ہاتھ اکھاڑے لے چلا
''اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں''
چاروں خانے چِت گرا، آنکھوں میں تارے آگئے
''مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں''
اک اندھیرا سا مری آنکھوں کے اوپر چھا گیا
''اک رِدائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں''
میں اکھاڑے میں نہ کرتا ہائے لیکن کیا کروں
''تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں''

میں گِرا ایسا کہ میرے سر میں گھنٹی سی بجی
''جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں''
آج کل خانہ نشیں ہوں اور پہلے تھا یہ حال
''اِس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں''
''کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا''
تھا فقط ضعفِ بصارت اور دھواں سمجھا تھا میں
جعفری تضمین میں اقبال کی تیرا یہ حال
یار تجھ کو تو بڑا اہلِ زباں سمجھا تھا میں

---

(1) بھولو پہلوان: ''رستم پاکستان'' پہلوان تھا

# سنجیدہ کلام

# حورانِ بہشت اور اقبال

۱

مقامِ حضرتِ اقبال تھا بہشت بریں
اسی مقام پہ حوریں تھیں اُن کے ساتھ مکیں
کہا یہ حوروں نے ان کو 'سنا کے' اُن کا کلام
کہ آپ طبقۂ نسواں پہ کرتے ہیں نفریں
لکھے ہیں آپ نے ضربِ کلیم میں یہ شعر
ذرا بتائیے یہ آپ نے کہے کہ نہیں
رکھا ہے آپ نے ''مردِ فرنگ'' کا عنواں
کہی وہ بات جو عورت پہ ہے ستم کے قریں

''مردِ فرنگ''

''ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا''
''مگر یہ مسئلہ زن رہا وہیں کا وہیں''

''قصور زن کا نہیں ہے کچھ اِس خرابی میں''
''گواہ اِس کی شرافت پہ ہیں مہ و پروین''
''فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور''
''کہ مرد سادہ ہے بے چارہ زن شناس نہیں''
سنا کے قطعۂ اقبال حور نے یہ کہا
چمک رہی ہے شرافت سے آدمی کی جبیں
یہ زن شناسی و مردوں کی سادگی کیا خوب
یہ سادگی ہے کہ جس کا پتہ نہیں ہے کہیں

۲

پھر بڑھی ایک حور اُن کی طرف
اور گویا ہوئی بہ جوش و خروش
آپ نے پوچھ کر یہ ایک سوال
اہلِ یورپ کو کردیا بے ہوش

''ایک سوال''

''کوئی پوچھے حکیم یورپ سے''
''ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش''
''کیا یہی ہے معاشرت کا کمال''
''مرد بیکار اور زن تہی آغوش''

بولی وہ حور پڑھ کے یہ اشعار
پہنچا ہم تک بھی یہ نوائے سروش
مرد ہیں سب حکیم یورپ میں
اہل مشرق ہیں اِن کے دوش بدوش
مرد بیکار و سادہ لوح سہی
عورتوں میں مگر ہے باقی ہوش
عورتیں رازِ زندگی کی امیں
مرد ہیں محوِ عیش و ناؤ و نوش
آپ ہوتے کہاں یہ بتلائیں
عورتیں ہوتیں گر تہی آغوش

۳

بڑھی تیسری حور کرتی یہ شکوہ
کہ صاحب یہ مردانگی تو نہیں ہے
کہ پردے کے عنوان سے شعر لکھ کر
کیا وہ جو ظلم و ستم کے قریں ہے
یہ سنئے کہ خود آپ نے یہ کہا ہے
کہ ہر ایک مصرع ستم آفریں ہے

## ''پردہ''

''بہت رنگ بدلے سپہر بریں نے''
خدایا یہ دنیا جہاں تھی وہیں ہے
''تفاوت نہ دیکھا زن و شو میں میں نے''
''وہ خلوت نشیں ہے، یہ خلوت نشیں ہے''
''ابھی تک ہے پردے میں اولادِ آدم''
''کسی کی خودی آشکارا نہیں ہے''

پڑھے شعرِ اقبال اور پھر یہ بولی
بتاؤ تو اندھیر ایسا کہیں ہے
تفاوت بہت ہے زن و شو کے اندر
کہ صبر و سکوں شوہروں میں نہیں ہے
جو عورت ہے تصویرِ صبر و وفا ہے
مگر بے وفا مرد حیلہ گزیں ہے
اِسی پر تو نازاں ہے اولادِ آدم
کہ عورت بشر کی خودی کی امیں ہے

۴

پھر ایک حور جو چوتھی تھی اور بہت محزوں
یہ بولی حضرتِ اقبال سے بہ رنجِ فزوں
تمام طبقۂ نسواں ہے اہل ہوش و خرد
خرد کے آپ ہیں دشمن زراہِ جذب و جنوں
لکھا ہے آپ نے عورت کے واسطے جو کچھ
سنیں جو آپ تو میں من و عن بیان کروں

"عورت"

"وجود زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ"
"اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دُروں"
"شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی"
"کہ ہر شرف ہے اُسی دُرج کا دُرِ مکنوں"
"مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن"
"اِسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں"

سنا کے حضرت اقبال کے یہ فرمودات
کہا یہ حور نے کتنا عجیب ہے مضموں

مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی تو کیا
کچھ اِس سے مرتبۂ زن نہ کم ہوا نہ فُزوں
سوائے آدمِ اوّل کے اور کوئی بھی
نہ پڑھ سکا کبھی تخلیقِ زندگی کا فُسوں

۵

آزادیٔ نسواں کی طرفدار تھی اک حور
وہ حضرت اقبال کو یوں دینے لگی پند
پہلے تو حضور اپنے ہی اشعار کو سُنیئے
جالے میں ہوں خود اپنے ہی مکڑی کی طرح بند

''آزادیٔ نسواں''

''اِس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا''
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند''
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب''
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند''
''اِس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش''
''مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خرد مند''
''کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ''
''آزادیٔ نسواں کہ زمرّد کا گلوبند؟''

جب پڑھ چکی اقبال کے یہ شعر تو وہ حور
بولی کہ بہت خوب ہیں مردانِ خرد مند
عورت کی بصیرت نے کیا فیصلہ اِس کا
اور بات کہی وہ کہ جو ہے خوب و خوش آیند
مردوں کو خبر کچھ نہیں بنتے ہیں خرد مند
''در جہلِ مرکبّ ابدالدہر بہ مانند''
آزادی کا مفہوم سمجھتے ہی نہیں مرد
افسوس کہ بے بہرہ ہیں عورت کے یہ فرزند
تعلیم ہے تہذیب ہے انسان کا زیور
آزادیِ نسواں ہے زمرد کا گلوبند

۶

پھرایک چھٹی حور نے کی شکوہ طرازی
اور حضرتِ اقبال سے بولی یہ بصد درد
عورت کی حفاظت کے جو عنواں سے کہا ہے
عورت کے حسیں دل پہ پڑی اُس سے بڑی گرد
بے سمجھے ہوئے آپ نے کہہ ڈالا ہے سب کچھ
کیا فائدہ گر حکمت و عرفاں میں ہوئے فرد

## ''عورت کی حفاظت''

''اک زندہ حقیقت مرے سینے میں ہے مستور''
''کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد''
''نے پردہ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی''
''نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد''
''جس قوم نے اِس زندہ حقیقت کو نہ پایا''
''اُس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد''

اقبال کے اِن شعروں پہ وہ حور یہ بولی
جو کہتے ہیں خود اِس کو سمجھتے نہیں یہ مرد
یہ نَرد کی بازی تھی کہ عورت رہے جاہل
مُدّت ہوئی دنیا میں کہ پِٹ بھی چکی یہ نَرد
اک زندہ حقیقت ہے جو عورت میں ہے مستور
اور اِس کو نہیں جانتے مردانِ جہاں گرد
مردانگیٔ مرد کی عورت ہے نگہباں
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے اگر مرد

۷

اک حور نے تعلیم اور عورت کا کیا ذکر
کہنے لگی، آپ کے شعروں کا اثر موت
پھر حضرتِ اقبال کے یہ شعر سنا کر
بولی کہ نہیں رکھتی ہے جنّت میں گذر موت

''عورت اور تعلیم''

''تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگ امومت''
''ہے حضرتِ انساں کے لیے اس کا ثمر موت!''
''جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن''
''کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت!''
''بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن''
''ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت!''

اشعار کو جب پڑھ چکی وہ حور تو بولی
مردوں کی نظر میں ہے اِدھر موت اُدھر موت
صرف آپ کے اشعار سے زن ہوتی ہے نازن
ہے جہل فقط مرگ نہیں علم و خبر موت

ہے مدرسۂ زن ہی فقط دیں کا محافظ
بچوں کے لیے ہوتی ہے مردوں کی نظر موت
ہے پاؤں تلے ماں کے جسے کہتے ہیں جنّت
آغوش میں مادر ہی کے ہے شہر بدر موت

۸

ابھی اقبال تھے اُلجھن میں پۓ غیب و شہود
آٹھویں حور ہوئی شکوے کی خاطر موجود
ان کے یہ شعر سنائے انہیں بے ِمنّتِ غیر
بولی عورت پہ ستم آپ کے ہیں لامحدود
آپ کہتے ہیں نہیں جوہرِ ذاتی اس میں
اور بے ِمنّتِ غیر اُس کی عبث بود و نُبود

"عورت"

"جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے مِنّتِ غیر"
"غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود!"
"راز ہے اِس کے تپِ غم کا یہی نکتۂ شوق"
"آتشیں لَذّتِ تخلیق سے ہے اِس کا وجود"
کھلتے جاتے ہیں اِسی آگ سے اسرارحیات"
"گرم اِسی آگ سے ہے معرکۂ بود و نبود!"

''میں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت''
''نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود!''

پڑھ چکی حضرتِ اقبال کے جب یہ اشعار
بولی وہ حور کہ یہ بات نہیں ہے محمود
آتشیں لذّتِ تخلیق ہے جس کے دم سے
اُسے بے کار سمجھتے ہیں تہہِ چرخِ کبود
آپ مظلومیٔ نسواں سے ہیں غمناک بہت
لیکن اشعار میں جذبہ یہ نہیں ہے موجود

بولے اقبال کہ اے عشوہ گرِ نورانی
کیا بتاؤں تجھے کیا شے ہے جہانِ فانی
چونکہ جنت میں میسّر ہے ہر اک آسانی
تم کو معلوم نہیں کیا ہے تہی دامانی
کس کو کہتے ہیں جہاں میں شَرفِ انسانی
مجھے ہر بات پڑی اب جو تمہیں سمجھانی
اِس سے بہتر ہے تمہارے لیے خاموش رہو
''فکرِ فردا نہ کرو محوِ غمِ دوش رہو''

---

# میر انیسؔ اور مرزا غالبؔ

(۲۹ اپریل ۷۲ء ''غالبؔ لائبریری'' میں ''شامِ انیسؔ'' کے موقع پر یہ نظم پڑھی گئی)

میر صاحبؔ نے یہ فردوس میں غالبؔ سے کہا
صفِ اوّل کے ادیب اور بہت سے شعرا
معترف ہیں کہ تمہیں حق سے ملی فکرِ رسا
لکھنؤ آئے مگر مرثیہ تم نے نہ پڑھا
اِس قدر سلطنتِ فکر میں سیاحی کی
کیوں نہ پھر حضرتِ شبیرؑ کی مداحی کی

بولے غالبؔ کہ مرا رنگِ سخن ہے تو نفیس
میں سلیمانِ غزل، فکرِ رسا ہے بلقیس
ہے تخیّل مِرا فردوس نشینوں کا جلیس
غازۂ روئے ادب ہیں مرے اشعارِ سلیس
لیکن اندازِ سخن آپ کا کیسے پاؤں
شہپرِ حضرت جبریل کہاں سے لاؤں

آپ کا مرتبہ یہ ہے کہ ہیں مدّاحِ امام
جن کی توصیف میں آیا لبِ کوثر پہ پیام
ان کو تسنیم کی موجوں نے کیا اُٹھ کے سلام
شوقِ مداحیِ شبیرؑ کا یہ ہے انجام
عرشِ اعظم پہ ملک صَلِّ علیٰ کہتے ہیں
آپ کو ذاکرِ شاہ شہدا کہتے ہیں

''نمکِ خوانِ تکلّم ہے فصاحت'' کس کی
''ناطقے بند ہیں سُن سُن کے بلاغت'' کس کی
رنگ اُڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت کس کی
شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت کس کی
میرے اور آپ کے اشعار کی ہے روح جدا
کس سے ہوسکتی ہے مدّاحیٔ ممدوح خدا

میر انیسؔ اس پہ یہ بولے کہ نہیں بھائی نہیں
منقبت آپ نے مولا کی لکھی ہے وہ حسیں
جس کو تسلیم کریں لوح و قلم، قلب و جبیں
اس سے ہوسکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں
مل ہی جاتا ہے جو ہوتا ہے کسی کا مقسوم
''لافِ دانش غلَط و نفعِ عبادت معلوم''

توسنِ طبع کو جس وقت کیا ہے مہمیز
مرثیے میں نکل آئے ہیں سخن دل آویز
آپ نے کی تھی خدا سے یہ دعا درد انگیز
''غمِ شبیرؑ میں سینہ ہو یہاں تک لبریز''
کہ رہیں خونِ جگر سے میری آنکھیں رنگیں''
آپ کو نعمتیں دیں جو نہیں ملتی ہیں کہیں

گفتگو جاری تھی اور غیب سے آئی یہ صدا
کردیا حقِّ غزل حضرتِ غالب نے ادا
میرصاحبؒ کے لیے مرثیہ انعامِ خدا
باغِ فردوس میں ہر پھول کی رنگت ہے جدا
''جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے''
''کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے''

---
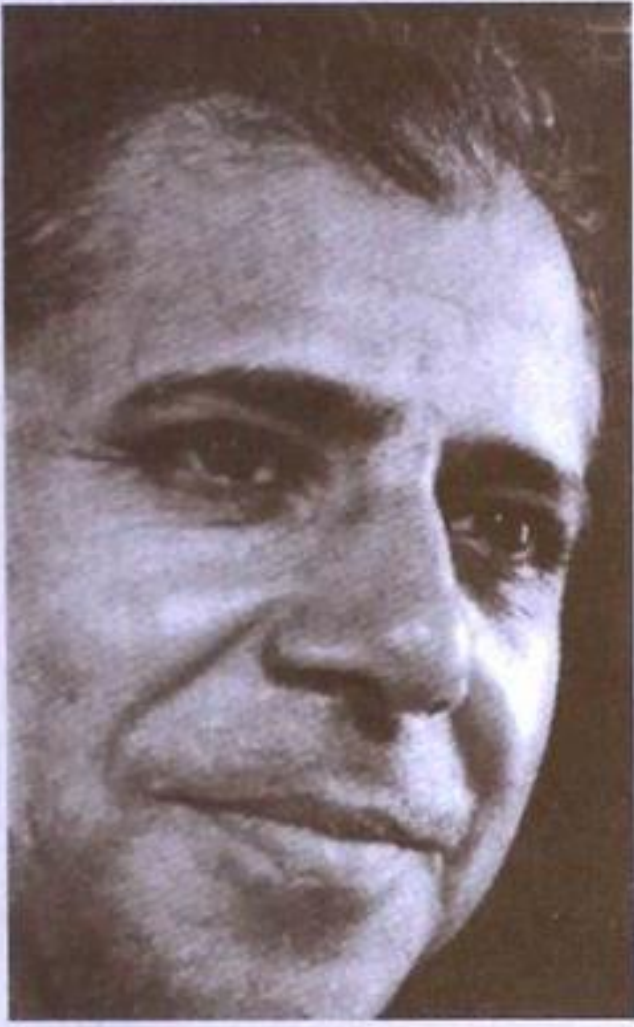
# تیرِ نیم کش

برِ صغیرِ ہند و پاک کے ذہین طنز و مزاح نگار سید محمد جعفری کا مجموعۂ کلام ہے۔

سید محمد جعفری ۱۹۰۵ء میں متولد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ منشی فاضل کا امتحان ۱۴ سال کے سن میں پاس کرلیا۔ ۱۹۲۲ء میں امتیاز کے ساتھ میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ ایس۔ سی آنرز (کیمیا) کی سند حاصل کی۔ اُس کے بعد اورنٹیل کالج لاہور سے ادبیات فارسی میں ایم۔ اے، ایم۔ او۔ ایل کیا اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور سے ادبیات انگریزی میں ایم۔ اے کیا۔ اُن کے اساتذہ میں پطرس بخاری بھی شامل تھے۔ شاعری کا آغاز کالج ہی سے ہوگیا تھا۔

جعفری صاحب نے میو کالج (حالیہ نیشنل کالج) آف آرٹس سے مصوری میں بھی مہارت حاصل کی۔ اُن کو خطاطی میں بھی دسترس حاصل تھی۔ ابتداء میں محکمۂ تعلیم سے منسلک رہے اور اس کے بعد وزارتِ اطلاعات و نشریات سے وابستہ ہوگئے۔ ۱۹۶۶ء میں ریٹائر ہوئے اور ۱۹۷۶ء میں خالقِ حقیقی سے جاملے۔

Rs. 350.00

www.sang-e-meel.com

ISBN 969-35-1941-8

9789693519419